قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

طلوع اسلام

ماہنامہ —— لاہور

خط و کتابت

ناظم ادارہ طلوع اسلام (رجسٹرڈ)

۲۵/بی۔ گلبرگ ۲، لاہور ۱۱

پوسٹ کوڈ —— ۵۴۶۶۰

ٹیلیفون : ۸۷۹۲۴۶

مجلس ادارت

مدیر مسئول: محمد لطیف چوہدری

معاون : ثریا عندلیب

ڈاکٹر صلاح الدین اکبر

ناشر : عطاء الرحمن آرائیں

طابع : خالد منصور نسیم

مطبع : النور پرنٹرز و پبلشرز

۳/۲ فیصل نگر ملتان روڈ۔ لاہور ۲۵

ٹیلیفون —— ۴۸۵۸۲۶

مقام اشاعت : ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲، لاہور ۱۱

جلد ۴۴ — اگست ۱۹۹۱ء — شمارہ ۸

بدل اشتراک

سالانہ

پاکستان —— ۱۲۰ روپے

بیرونی ممالک —— ۱۸ امریکی ڈالر

فی پرچہ : -/۱۰ روپے

فہرست مضامین

۱۔ لمعات	ادارہ	۲
۲۔ مملکتوں کے بقا و فروغ کا اصول	محمد عمر دراز	۵
۳۔ ضیائے ذکر قرآنی	ثریا عندلیب	۷
۴۔ عائلی قوانین	محمد لطیف چوہدری	۱۱
۵۔ آدھی انسان	بشیر احمد عابد	۱۴
۶۔ فکر پرویز اور ہمارے دانشور	محمد عمر دراز	۲۳
۷۔ کتاب و سنت	ادارہ	۴۶
۸۔ مجلس استفسارات	جنرل احسان الحق	۵۰
۹۔ حقائق و عبر	ادارہ	۵۸
۱۰۔ اسلام خطرے میں ہے	ادارہ	۶۲
۱۱۔ قرآن بچوں کے لئے	[illegible]	۷۰
۱۲۔ اشتہار النور پبلشرز	النور پبلشرز	۷۳
۱۳۔ A TEACHER WAS BORN	شمیم انور	۸۰

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لمعات

ایک مہذب ملک اور آئین و قوانین کا احترام کرنے والا معاشرہ' اس لئے آیۂ رحمت ہوتا ہے کہ اس میں ہر فرد محسوس کرتا ہے کہ اس کی جان، مال، عزت، آبرو محفوظ ہے اور یہی وہ احساس ہے جس سے اس کی زندگی امن اور سکون سے گذرتی ہے۔ اگر آپ کو ہر وقت دھڑکا لگا رہے کہ نہ معلوم آپ کا ہمسایہ کس وقت آپ کی عزت اور ناموس پر ہاتھ ڈالدے۔ اگر آپ کو ہر آن خطرہ رہے کہ راستہ چلنے والے نہ جانے کب آپ کی جان اور مال پر حملہ کر دیں تو آپ کی زندگی جس عذاب میں گذرے گی اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ہم جن لوگوں میں بستے ہیں اُن کی طرف سے حفاظت کی ضمانت ہی وہ اطمینان ہے جس سے زندگی کی گاڑی چلتی رہتی ہے۔ اگر یہ اطمینان اٹھ جائے تو جینا محال ہو جائے۔ قرآن کریم نے انسانی معاشرہ کا جو بلند ترین نقشہ پیش کیا ہے اس کی اوّلین خصوصیت یہ بتائی ہے کہ اس میں افراد معاشرہ کے لئے نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حُزن۔ ایسے جنت بداماں معاشرہ کو مسلمانوں کے ہاتھوں تکمیل پذیر ہونا تھا۔ اِسی لئے حضور نبیٔ اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھوں اور زبان سے دوسرا مسلمان محفوظ رہے۔ آپ تہذیب و شائستگی کے اس تقاضے، آئین و ضوابط کے اس احترام اور مسلمانوں کی اس تعریف کو سامنے رکھیں اور دیکھیں کہ ہم کس مقام پر کھڑے ہیں۔ پورا ملک ابتری کا شکار ہے۔ سندھ ڈاکوؤں کے نرغے میں ہے۔ سندھ کے بعد اب پنجاب میں بھی صورتِ حال تیزی سے بگڑ رہی ہے۔ بے گناہ شہریوں کے قتل، بنکوں میں ڈاکے، اغوا اور راہ چلتے لوگوں کو لوٹنے کے واقعات معمول بن چکے ہیں۔ وحشت گردی اور قتل و غارت گری کے واقعات نے لوگوں کو سراسیمہ کر دیا ہے۔

وہ کونسی آنکھ ہے جو ہر روز اس عبرت انگیز منظر کا تماشا نہیں کرتی اور وہ کونسا دل ہے جو ہر آن اس الم انگیز حقیقت کا احساس نہیں کرتا۔ حالات کی یہ خرابی نہ کسی ایک صوبے تک محدود ہے نہ کسی خاص طبقہ سے مخصوص۔ روزمرہ واقعات کی شدت وسعت اور گہرائی کا اندازہ اس سے لگائیے کہ عوام تو ایک طرف، اربابِ حل و عقد بھی بوکھلائے ہوئے ہیں۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس ابتری کا علاج کیا ہے۔ نتیجہ یہ کہ پورا ملک مایوسی کی لپیٹ میں آ چکا ہے۔ ہر شخص اپنے آپ کو بے بس محسوس کر رہا ہے۔

سوال یہ ہے کہ ان حالات کے سُدھرنے کی کوئی صورت ہو سکتی ہے؟ کیا ان خرابیوں کا کوئی علاج ممکن ہے؟ کیا ہم اس عذاب سے نجات پا سکتے ہیں؟ کیا ہماری بازآفرینی کی کوئی صورت نکل سکتی ہے؟ بعض لوگ اس پریشانیٔ فکر و نظر اور سراسیمگیٔ قلب و نگاہ کو موجود حکمرانوں کے کھاتہ میں ڈال کر اس خوش فہمی میں مبتلا نظر آتے ہیں کہ حکومت بدلتے ہی حالات بدل جائیں گے حالانکہ حکومت کی تبدیلی ہمارے لئے کوئی نیا تجربہ نہیں۔ پچھلے چوالیس برس میں کئی حکومتیں مٹیں اور ان کی جگہ نئی حکومتیں بنیں۔ ہر جانے والی حکومت پر لوگوں نے شکرانے کے نفل پڑھے اور ہر آنے والی کا استقبال ان توقعات کے ساتھ کیا کہ وہ ان کے دکھوں کا مداوا ثابت ہو گی لیکن چند دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ یہ توقعات فریبِ نفس سے زیادہ کچھ نہ تھیں۔ نئی حکومت، پرانی حکومت سے بھی بدتر ثابت ہوئی۔ سوال پھر یہ ہے کہ اس کی وجہ کیا ہے کہ وزارتوں کی اس قدر تبدیلیوں کے باوجود ملّت کی کشتی بھنور سے نکلتی ہی نہیں! اس کی وجہ ظاہر ہے۔ ہمارے ہاں چند افراد ہیں جن کے مجموعہ کا نام "اوپر کا طبقہ" ہے۔ وزارت اور حکومت انہی چند افراد کے اندر گردش کرتی رہتی ہے جسے وزارتوں کا ٹوٹنا اور بننا کہتے ہیں، وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ ان افراد کی کرسیاں بدلتی رہتی ہیں۔ جو کل سفیر تھا آج وزیر ہے۔ جب وزارت ٹوٹتی ہے تو پھر یہ کہیں سفیر بن کر چلا جاتا ہے اور اس کی جگہ انہی میں سے کوئی اور وزیر آ جاتا ہے۔ آپ نے اکثر دیکھا ہو گا کہ ایک تھیٹریکل کمپنی میں ایکٹر دس بیس ہی ہوتے ہیں لیکن یہ کمپنی ہر شام ایک نیا کھیل سٹیج پر پیش کرتی ہے۔ اس میں ہوتا یہی ہے کہ جو آج کے ڈرامے میں قاتل ہے وہ آنے والے کھیل میں مقتول بن جاتا ہے۔ جو کل کے کھیل میں چور تھا آج کے ڈرامے میں قطب بن کر سامنے آ جاتا ہے۔ قوم کی تقدیر انہی لوگوں کے ہاتھ میں بنتی اور بگڑتی ہے جنہیں

"اوپر کا طبقہ" کہا جاتا ہے۔ اگر یہ طبقہ اچھا ہے تو قوم کی تقدیر بھی اچھی ہو گی اور اگر یہ بُرا ہے تو عذاب قوم کو بھگتنا ہو گا۔ یہ طبقہ بالعموم دولت مندوں پر مشتمل ہے۔ دولت کی بنا پر یہ لوگ پہلے اوپر آ گئے تھے اور اب اسی دولت کے بل بوتے پر اقتدار کو اپنے حلقے کے اندر رکھے ہوئے ہیں۔ حکومت کی کرسیاں چونکہ کم ہیں، اس لئے ہوتا یہ ہے کہ ان میں سے جن لوگوں کے حصے میں کرسی نہیں آتی وہ کرسی نشینوں کی ٹانگ کھینچنے کی درپے رہتے ہیں اور جب اس میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو انہیں کرسیوں سے اتار کر ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔ پچھلے چوالیس سال سے یہی کچھ ہو رہا ہے۔ لہٰذا نظام تبدیل کئے بغیر حکومت بدلنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ہاں البتہ "اوپر کا طبقہ" چاہے تو ملک میں پھیلی ہوئی ابتری دُور نہیں تو، کم ضرور کی جا سکتی ہے۔ دورانِ انتخاب ہمارے یہ سیاستدان اپنے حلقے میں قریہ قریہ گھومتے ہیں، ہر دروازے پر دستک دیتے ہیں، ہر فرد سے ملتے ہیں۔ انہیں اپنے وسائلِ حرب کا علم بھی ہوتا ہے اور اپنے مخالفین کی قوتِ ضرب کا اندازہ بھی۔ لہٰذا ان حلقوں میں رہائش پذیر بدکردار اور بدقماش لوگوں کا علم ان سے بہتر اور کس کو ہو سکتا ہے؟ اس لئے یہ ذمہ داری منتخب نمائندگان کو کیوں نہیں سونپی جاتی کہ وہ اپنی حفاظت کے لئے گاڑیاں خریدنے اور کلاشن کوف بردار محافظ جمع کرنے کی بجائے اپنے حلقوں کو ناجائز اسلحہ اور غنڈہ عناصر سے پاک کرنے میں حکومت کا ہاتھ بٹائیں تاکہ ان کے ووٹر بھی سُکھ کا سانس لے سکیں۔ اس سے نہ صرف ملک میں امن و امان کی فضا بحال ہو گی بلکہ عوام کا یہ خوف بھی دُور ہو جائے گا کہ غنڈہ عناصر یا تو سیاست دانوں کے محافظ دستوں میں شامل ہیں یا انہیں ان کی سرپرستی حاصل ہے لہٰذا ان کے خلاف لب کشائی اپنے آپ کو موت کے منہ میں دھکیلنے کے مترادف ہے [illegible] حکومت [illegible] [illegible] گرد [illegible] انہیں [illegible] جس کی ان سے [illegible] ہو سکتا ہے لیکن اس [illegible] جن کی نشاندہی، ان حالات [illegible] تک پہنچانا حکومت کا فریضہ۔ عوام کو یہ مایوسی [illegible] جائے کہ ووٹ دیتے وقت انہوں نے سوچ سمجھ سے کام نہیں لیا تھا۔

نگارشاتِ پرویز

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مملکتوں کے بقا و فروغ کا ابدی اصول

اللہ تعالیٰ نے بعثتِ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی غایت یہ بتائی ہے:۔

...... وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ...... (۷/۱۵۷)

"اور وہ ان بوجھوں کو اتار دے گا جن کے نیچے نوعِ انسانی دبی ہوئی چلی آ رہی تھی اور ان زنجیروں کو توڑ ڈالے گا جن میں وہ جکڑی ہوئی تھی۔"

اور آپ کی نبوت پر ایمان لانے اور آپ کی تعلیم کے مطابق اعمالِ صالحہ سے کیا ملے گا؟

"استخلاف فی الارض یعنی ——— سرفرازی و حکمرانی"

یہ خدائے جلیل کے اس وعدہ کی تفسیر ہے کہ:۔

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ...... ۝ (۲۴/۵۵)

اور امن و سکون اور خوشحالی!

وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا...... ۝ (۲۴/۵۵)

اس قسم کا امن و سکون اور اس قسم کی بے خوفی کا عالم، کہ آپؐ نے فرمایا کہ میں ایسا نظام قائم کروں گا جس میں حالت یہ ہوگی کہ یمن کی ایک عورت تن تنہا صحراؤں اور بیابانوں سے سفر کرتی ہوئی شام تک چلی جائے گی اور اسے کسی قسم کا خطرہ نہ ہوگا ——— اور آپؐ نے ایسا کر کے دکھا دیا۔

اس قسم کا خوف و حزن سے پاک ماحول اور بنیادی ضروریاتِ زندگی کی اس قسم کی فراوانی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

"جس بستی میں کسی ایک شخص نے صبح یوں کی کہ وہ رات بھر بھوکا رہا۔ اس بستی سے خدا کی حفاظت کا ذمہ اٹھ گیا۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی ارشاد کے پیشِ نظر سربراہِ مملکتِ اسلامی کی ذمہ داری کا یہ احساس تھا جسے حضرت عمرؓ نے ان الفاظ میں دہرایا کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے :-

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا ۝ (۱۱ : ۶)

اس لئے :-

"اگر دجلہ کے کنارے ایک کتا بھی بھوک سے مرگیا تو خدا کی قسم عمر سے اس کی بھی باز پرس ہوگی"

جب اللہ تعالےٰ کی نازل کردہ کتاب کے مطابق نظامِ مملکت (الدین) کا قیام عمل میں آتا ہے تو اس کے ثمرات سے جو جنت وجود میں آتی ہے اسے دیکھ کر دنیا کی ہر قوم اس نظام کیلئے چشم براہ ہوتی ہے اور اسلامی مملکت کی سرحدیں پھیلتی ہی چلی جاتی ہیں۔ آپ غور فرمائیں کہ نبی اکرمؐ کے عہدِ ہمایوں میں اسلامی مملکت کا رقبہ دس لاکھ مربع میل تھا اور اس کے بعد خلفائے راشدینؓ، بالخصوص حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں اس کی سرحدیں بائیس لاکھ مربع میل تک پھیل گئی تھیں۔ یہ ہے اصول، مملکت کی بقاء اور فروغ کا۔ یعنی :-

"اندرونی خوشحالی اور امن وسکون سے مملکت کی سرحدیں باہر کی طرف پھیلتی اور وسیع ہوتی چلی جاتی ہیں۔ جبکہ مملکت کی حدود میں امن وسکون کے فقدان اور حفاظتِ مال وجان کی طرف سے عدم اطمینان اور معاشی بدحالی سے اس کی سرحدیں اندر کی طرف سکڑتی ہیں اور بالآخر اس کا نام ونشان تک دنیا کے نقشہ پر قائم نہیں رہتا"

اور یاد رکھئے امن وسکون اور معاشی خوش حالی ممکن نہیں اس نظام کے بغیر جس کے متعلق خالقِ کائنات نے فرمایا ہے :-

الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا (۵ : ۳)

یعنی قرآن کریم کا عطا فرمودہ نظامِ مملکت

ثریا عندلیب

ضیائے فکر قرآنی

۱۔ بھرپور محنت سے کماؤ لو اتنا ہی جتنی جائز ضرورت ہے۔ یہ ہے "عمل صالح"

۲۔ جو طالب علم ہے وہ تو عمر کے آخری حصے تک طالب علم ہی رہتا ہے۔ یہ ہے "قُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا" کا مفہوم۔

۳۔ خدا کی صفات تا حدِ بشریت جس کی ذات سے منعکس ہوں اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ خدا کے نام پر اقتدار سنبھالے اور معاشرہ میں احکام و قوانینِ خداوندی نافذ کرے

۴۔ اقبال رحمہ نے کتاب و حکمت کا دین و دانش بڑا صحیح ترجمہ کیا ہے۔ جب اس نے کہا تھا: "متاعِ دین و دانش لُٹ گئی" تو اس کا مطلب یہ تھا کہ اس قوم کے ہاتھوں سے قرآن بھی گیا اور عقل و فکر بھی باقی نہ رہی۔

۵۔ خدا کو جس بات کیلئے بھی پکارا جائے گا۔ اس کا جواب اس کے کلام (قرآن) میں مل جائے گا۔ مگر خدا کہتا ہے فَاسْتَجِیْبُوْا لِیْ پہلے میری بات کا تو جواب دو۔ مطلب یہ ہے کہ پہلے خدا کے احکام پر عمل تو کرو۔

۶۔ دین میں تفرقہ ڈالنے سے جو شرک پیدا ہوتا ہے وہ دلائل سے بھی نہیں مٹتا۔

۷۔ اللہ کا قانون اس قوم پر عروج و ارتقاء کی راہیں کبھی نہیں کھولتا جو حقائق کو اپنی جگہ نہیں رہنے دیتی۔

۸۔ آدم کا تو تعارف ہی اس کی معصیت سے کرایا گیا ہے اور شرفِ انسانیت تو یہی ہے کہ ظلم و ستم کا اختیار رکھتے ہوئے ظلم و ستم نہ کیا جائے۔

۹۔ ایک فرد کے سینے میں دو متضاد قسم کے جذبات میں جو تصادم رہتا ہے جس سے اس کی ذہنی کشتی ڈولتی رہتی ہے اسے شیطان کہتے ہیں۔

۱۰۔ کسی محنت کش کی محنت کا استحصال نہ کرنا نیکی ہے۔ اس سے چھینی ہوئی دولت سے سبیل لگا دینا نیکی نہیں ہے۔

۱۱۔ انسان کے سامنے کیریکٹر کا دارومدار اس کے وعدے پر ہوتا ہے اور وعدے کا پورا کرنا مسلمان ہونے کی شرط ہے

۱۲۔ اسلامی معاشرہ وہ ہوگا جس میں کوئی شخص اپنے آپ کو مجبور لہٰذا مایوس نہیں پائے گا۔

۱۳۔ انسانی تہذیب و ثقافت کی عمارت صرف احترامِ ذات کے ستون پر قائم رہ سکتی ہے۔

۱۴۔ صحیح نظامِ خداوندی وہ ہے جس میں کائناتی قوتیں اور وحیٔ خداوندی دونوں ایک صف میں کھڑی ہو جائیں۔

۱۵۔ مغفرت سے مراد یہ ہے کہ انسان بڑے بڑے اعمالِ حسنہ کے ذریعے چھوٹی چھوٹی لغزشوں کے مضر اثرات سے اپنے آپ کو محفوظ کر لیتا ہے۔

۱۶۔ سفارش اور بخشش کا تصوّر اس ذہنیت کا پیدا کردہ ہے جس کی رُو سے اللہ کو ارضی بادشاہوں کے قالب میں ڈھالا جاتا ہے۔ قرآن نے جس خدا کا تصوّر دیا ہے اس کی ہر بات قاعدے اور قانون کی رُو سے ہوتی ہے اور قاعدے اور قانون میں سفارش اور بخشش کا سوال ہی نہیں ہوتا۔

۱۷۔ آپ کسی کو بھی اپنے عقیدے کے پیچھے میں مجبور نہیں کر سکتے۔ تاوقتیکہ آپ [illegible] کے لئے اپنا محاسبہ [illegible] اس نے کہا یہ تھا کہ میں تمہارا [illegible] فرعون کا انا (ربّ) ہونے کا تھا۔

۱۸۔ [illegible] کہ مذہب جس قدر آگے بڑھتا جائے گا۔ دین اسی قدر پیچھے ہٹتا جائیگا۔

۱۹۔ قرآن کے نزدیک مفلسی اور ناداری کا بنیادی سبب نظامِ سرمایہ داری ہے۔ جب تک اس نظام کی جڑیں نہیں کٹتیں کراہنے والوں کی دلخراش صدائیں خاموش نہیں ہو سکتیں۔

۲۰۔ خدا کا دیا ہوا رزق بھی اگر اس کے قانون کے خلاف غلط طریقوں سے کھایا جائے تو وہ حرام ہو جاتا ہے فی الذّات کسی چیز کا حرام ہونا اور بات ہے

۲۱۔ دنیا میں اسلام کو بطور ایک سچے دین کے وہی شخص پیش کر سکتا ہے جو دوستوں کی محفل میں ہی نہیں بلکہ دشمنوں کے بھرے مجمع میں بھی اپنی زندگی کو اپنی صداقت کی شہادت میں پیش کر سکے اور پھر اس کیخلاف کسی کو انگلی اٹھانے کی جراٴت نہ ہو۔ یہی اسلام کی تبلیغ کا صحیح طریقہ ہے۔

۲۲۔ اخوّت، مساوات، حریّت، وحدتِ انسانی، خدا اور بندے کا براہِ راست تعلق۔ جماعتی زندگی، مرکزیّت، اطاعت، فرد کا ملّت میں گم ہو جانا اور ملّت کا افراد کی ربوبیّت کا سامان فراہم کرنا۔ یہ ہیں اس نظامِ حقیقی کی خصوصیات جو قرآنِ کریم کے ذریعے اللہ نے انسانوں کو عطا کیا ہے۔

۲۳۔ اگر انسانی ذات کے متعلق بات سمجھ میں نہ آئے تو اسلام کے متعلق بات سمجھ میں آ ہی نہیں سکتی۔ کیونکہ

اسلام کا سارا نظام انسانی ذات کی نشوونما اور ارتقاء ہی کے لئے ہے۔

۲۴۔ قرآن ضابطۂ زندگی کی کتاب ہے جس کی اپنی اصطلاحات ہیں۔ جب تک ان اصطلاحات کا مفہوم خود قرآن سے متعیّن نہ کیا جائے اس کا مقصود سمجھ میں نہیں آسکتا۔

۲۵۔ جب تک افکار میں پختگی نہ آجائے مقامِ دعوت و عزیمت کا قصد یا آرزو خیالِ خام ہی نہیں بلکہ حیات نمائی اور ہلاکت فروشی ہے۔

۲۶۔ اشخاص کی امامت کا دَور ختم ہو چکا ہے۔ اب آئیڈیالوجی اور نظام کی امامت کا دَور ہے ختمِ نبوت کا یہی مفہوم ہے۔

۲۷۔ خدا تک پہنچنے کے لئے مقامِ آدم حاصل کرنا ضروری ہے اور آدم وہ ہے جس کی مشہود زندگی کی ابتدا اس ارض سے ہوتی ہے۔ لہٰذا جس آدم کیلئے ارض و معاش کی مشکلات حل نہیں ہوئیں اس کی نگاہیں اوپر کیا اٹھ سکیں گی:

نہ تجھ پہ سہل ہوں جب تک زمیں کے ہنگامے
بُری ہے مستیٔ اندیشہ ہائے افلاکی

۲۸۔ جب کسی معاشرے میں ہر فرد اپنی اپنی حفاظت کی فکر میں ہی لگا رہے تو اس معاشرے کا توازن بگڑ جاتا ہے اور اس میں اس طرح کھلبلی مچ جاتی ہے کہ جو کمزور نیچے گرتا ہے وہ کچلا جاتا ہے۔

۲۹۔ خدا پر ایمان کے بغیر اخلاق کا تصور ہی ناممکن ہے لیکن خدا سے مراد قرآنی خدا ہے نہ کہ ذہنِ انسانی کا تراشیدہ بُت۔

۳۰۔ خدا پر ایمان لانا درحقیقت اپنے آپ کا صحیح صحیح اندازہ لگانا اور اپنی منزلِ مقصود کو پہچاننا ہے۔

۳۱۔ جس طرح صدف میں قطرے کی تربیّت ایک خاص انداز کے مطابق ہوتی ہے اسی طرح جوہرِ انسانیّت (خودی) تربیّت سے پختگی حاصل کرتے ہیں۔

۳۲۔ اسلام نے انسان کو وہ آزادی عطا کی ہے جو اسے کسی اور جگہ سے نہیں مل سکتی تھی۔

۳۳۔ انسانی آزادی میں سب سے بڑا اور مشکل مرحلہ یہ ہے کہ قانون کو نافذ کرنے والے دوسروں سے اپنی اطاعت نہ کرائیں بلکہ قانون کی اطاعت کرائیں۔ اگر ایسا ہو تو پھر انسان کو صحیح آزادی حاصل ہے۔

۳۴۔ قرآن کے شجرۂ مقدسہ پر ایک مدت سے انسانی تعلیمات کی اکاس بیل چڑھی ہوئی ہے۔ اپنی دانست میں شجرۂ اسلام کی تقویّت کی جس قدر کوشش ہو رہی ہے وہ دراصل ان بیل اس غیر جنس کی تقویّت کا موجب ہوتی جاتی ہے۔ اسلام کی برومندی و بار آوری کیلئے سب سے پہلے اس بیل کو اتار کر پھینک دینا

اضافہ کر دینا ضروری ہے اس کے بعد اصل درخت کی پرورش خود بخود ہو جائے گی۔

۳۵۔ وہ لوگ جو دانستہ قرآن کریم سے اعراض برتتے ہیں اور وہ جو غلط تعلیمات کو عقیدت کی بنا پر قرآنی تعلیمات سمجھتے ہیں اور باوجود متنبہ کئے جانے کے پھر بھی اپنے آپ کو راہِ راست پر سمجھتے ہیں، دونوں برابر ہیں۔ اس لئے کہ اگر سنکھیا کو زہرِ قاتل سمجھ کر کھاؤ یا تریاق سمجھ کر نگل جاؤ۔ ہلاکت دونوں صورتوں میں لازمی ہے۔

WANTED TRANSLATORS

For undertaking translation into

ENGLISH, FRENCH,ARABIC, PUSHTO, BALUCHI ETC

of urdu works of

ALLAMA GHULAM AHMED PARWEZ

including 2nd half of Mafhoom-ul-Quran
we need experts who,apart from being at home in

URDU AND ARABIC

have command over any one or more of the above LANGUAGES.
Intending persons are requested to contact the undersigned with credentials
for settlement of terms.

....

Executive Head
TOLU-E-ISLAM TRUST
25 B, GULBERG II
LAHORE

.....

محمد لطیف چوہدری

عائلی قوانین

تنظیم اسلامی کے امیر ڈاکٹر اسرار احمد صاحب عائلی قوانین مجریہ ۱۹۶۱ء کے خلاف ایک بار پھر میدان میں اُترے ہیں۔ ۳۰ مئی ۱۹۹۱ء کے اخبارات میں شائع ہونے والے ان کے اشتہارات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس بار وہ ان قوانین کے خلاف ملک گیر احتجاجی تحریک چلانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ تاہم اپنے موقف کی تائید میں انہوں نے جن علماء کی آراء کا سہارا لیا ہے ان میں جماعت اسلامی کے بانی حضرت مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا اسم گرامی بھی درج ہے جس سے نظر آتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب یہ کیس ہار جائیں گے کیونکہ دنیا جانتی ہے کہ ہمارے ملک میں ۱۹۶۱ء میں جو عائلی قوانین نافذ ہوئے تھے وہ ان مصری عائلی قوانین کا چربہ تھے جو مصر میں ۱۹۲۹ء میں نافذ کئے گئے تھے۔ اس وقت ہمارے علماء نے ان کی خوب خوب تعریف کی تھی۔ جناب ابوالاعلیٰ مودودی صاحب ان تعریف کرنے والوں میں نہ صرف پیش پیش تھے بلکہ انہوں نے ایک مستقل کتاب کی صورت میں ان قوانین کو اُردو زبان کا جامہ پہنایا تھا۔ ان کی یہ کتاب "حقوق الزوجین" کے نام سے مشہور ہے۔ مولانا مودودی مرحوم کی اس کتاب کی مخالفت ڈاکٹر صاحب کے لئے شاید اس لئے بھی مشکل ہو کہ یہ کتاب اس دَور کی ہے، جب ڈاکٹر صاحب بنفسِ نفیس جماعت اسلامی کی سٹیج پر جلوہ افروز تھے۔ ایسے عائلی قوانین کی مخالفت کے پسِ پردہ احیائے اسلام کے علاوہ اگر کوئی اور جذبہ نہیں تو ڈاکٹر صاحب کو چاہیئے کہ ملک کا امن و امان تباہ کرنے اور خواتین کی مخالفت مول لینے سے پہلے وہ اپنے استادِ مکرم مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی کتاب "حقوق الزوجین" کی ضبطی کا مطالبہ کریں کیونکہ عائلی قوانین مجریہ ۱۹۶۱ء اگر ان کی نظر میں غیر شرعی ہیں تو مولانا مودودی مرحوم کی مذکورہ کتاب میں بھی ایسا مواد یقیناً موجود ہے جو ان قوانین سے مماثلت رکھتا ہے۔ پوری کتاب کا تقابلی جائزہ تو کسی ایک مقالے میں ممکن نہ ہوگا۔ تاہم ڈاکٹر صاحب کی اطلاع کے لئے کتاب کے کچھ حصوں کی نشاندہی بے جا نہ ہوگی۔

صغر سنی کی شادی

صغر سنی کی شادیوں سے ہمارے معاشرے میں جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مودودی صاحب نے اپنی اس کتاب میں فرمایا:۔

"اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ کم سنی کے نکاحوں کی روک تھام کی جائے اور کم از کم ایسے نکاحوں کو لازم قرار نہ دیا جائے، کیونکہ اکثر لڑکے، جن سے ابتداء میں اچھی توقعات قائم کی جاتی ہیں، آگے چل کر سخت بداخلاقیوں اور بری عادتوں اور فاسد اعتقادات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔"

(حقوق الزوجین، جلد ششم مطبوعہ لاہور ص ۱۱۹)

عائلی قوانین میں ایسی شادیوں کی روک تھام کے لئے، شادی کے لئے لڑکے اور لڑکی کی عمر بالترتیب اٹھارہ اور سولہ سال مقرر کر دی گئی تھی۔

نکاح کی رجسٹریشن

ہمارے ہاں ننانوے فیصد شادیاں ایسی ہوتی ہیں، جن میں شادی سے پہلے بھی حق مہر ادا نہیں کیا جاتا ہے۔ صرف کاغذی خانہ پُری ہوتی ہے اور یہ حق مہر بعد میں بھی عام طور پر ادا نہیں کیا جاتا۔ اس سے ہمارے معاشرے میں مختلف قسم کی خرابیاں پیدا ہو رہی تھیں، ان خرابیوں کی اصلاح کے لئے جناب مودودی صاحب نے تجویز فرمایا:۔

"لیکن اگر مہر مؤجل ہو (یعنی بعد میں ادا کیا جانا ہو) تو لازم قرار دیا جائے اور زرِ مہر پر پچاس فیصدی کا اسٹامپ لگایا جائے۔ اسٹامپ کے بغیر یا پچاس فیصدی سے کم قیمت کے اسٹامپ پر کوئی دستاویزِ مہر، قابلِ ادخالِ دعویٰ نہ ہو۔ اس قسم کا ضابطہ اگر بنا دیا جائے تو مہرِ مؤجل کا یہ سرتاپا عیب بآسانی مسدود ہو جائے گا۔"

(ایضاً ص ۱۲۵)

ان بھاری اخراجات کی رجسٹریشن کی بجائے، عائلی قوانین میں صرف سادہ فارموں پر اندراج کو کافی سمجھا گیا لیکن اب جماعتِ اسلامی والے اس اندراج کو خلافِ اسلام قرار دے رہے ہیں۔ حالانکہ مودودی صاحب نے اسے خود تجویز کرتے ہوئے یہ فرمایا تھا کہ اس سے بہت سے جھگڑے ختم ہو سکتے ہیں۔

تعددِ ازواج

تعددِ ازواج کی وجہ سے معاشرے میں جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، ان کے بارے میں جناب مودودی رقمطراز ہیں:

"قرآن مجید میں تعددِ ازواج کی اجازت، عدل کی شرط کے ساتھ دی گئی ہے اگر کوئی شخص عدل نہ کرے، تو اسے اس مشروط اجازت سے فائدہ اٹھانے کا حق نہیں خود اس آیت میں، جہاں تعددِ ازواج کی اجازت دی گئی ہے، صاف حکم موجود ہے کہ اگر عدل نہ کر سکو تو ایک ہی بیوی رکھو۔ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ جو شخص دو یا زائد بیویوں کے درمیان عدل نہیں کرتا اور ایک طرف جھک کر دوسری کے حقوق ادا کرنے میں کوتاہی کرتا ہے، وہ ظالم ہے، تعددِ ازواج کی اجازت سے فائدہ اٹھانے کا اس کو کوئی حق نہیں ہے، قانون کو ایسی حالت میں اسے صرف ایک بیوی رکھنے پر مجبور کرنا چاہیئے اور دوسری بیوی یا بیویوں کو اس کے خلاف قانون سے دادرسی پانے کا حق ہونا چاہیئے۔"

(ایضاً صفحات ۴۱، ۴۲)

عائلی قوانین میں تعددِ ازواج پر ایسی ہی پابندی لگائی گئی ہے!

طلاقِ بدعت

ہمارے ہاں ایک ہی مجلس میں بیٹھے بیٹھے لوگ طلاق کا لفظ تین دفعہ بول کر اپنی بیوی کو جدا کر دیتے تھے، فقہا کی اصطلاح میں اسے طلاقِ بدعت کہتے ہیں کیونکہ اس کی ابتدا بعد میں ہوئی۔ یہ طلاق خلافِ اسلام تھی اور اس سے معاشرے میں بہت سی خرابیاں پیدا ہو رہی تھیں۔ عائلی قوانین میں طلاق کے اس طریقے کو خلافِ قانون قرار دے کر، طلاق کے اسلامی طریقے کو قانوناً رائج کیا گیا تو جماعت اسلامی سمیت علماء نے اس کی مخالفت شروع کر دی۔ حالانکہ اس سے پہلے اس طلاق کے بارے میں مودودی صاحب خود یہ تحقیق پیش کر چکے ہیں، ملاحظہ ہو:

"بیک وقت تین طلاق دے کر عورت کو جدا کرنا، نصوصِ صریحہ کی بنا پر معصیت ہے علمائے امت کے درمیان اس مسئلہ میں جو کچھ اختلاف ہے، وہ صرف اس امر میں ہے کہ ایسی تین طلاقیں، ایک طلاق رجعی کے حکم میں ہے یا تین طلاق مغلظہ کے حکم میں۔"

لیکن اس کے بدعت اور معصیت ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں، سب تسلیم کرتے ہیں کہ یہ فعل اس طریقے کے خلاف ہے، جو اللہ اور اس کے رسولؐ نے طلاق کے لئے مقرر کیا ہے اور اس سے شریعت کی اہم مصلحتیں فوت ہو جاتی ہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو بیک وقت تین طلاقیں دیں تو حضورؐ غصے میں آکر کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ اللہ عزّ وجل کی کتاب سے کھیل کیا جاتا ہے۔ حالانکہ ابھی میں تمہارے درمیان موجود ہوں۔ (ایضاً ص ۱۵۴)

لیکن جب عائلی قوانین میں اللہ کی کتاب کے ساتھ یہ کھیل ختم کیا گیا، تو جماعت اسلامی نے اس اقدام کی مخالفت شروع کر دی۔

خلع

جس طرح شریعت اسلامی نے شادی کا معاہدہ ختم کرنے کے لئے، مرد کو طلاق کی اجازت دی ہے، اسی طرح بیوی کو خلع کا اختیار دیا ہے کہ اگر وہ کسی وجہ سے اپنے خاوند کو ناپسند کرتی ہے تو وہ اس سے علیحدگی اختیار کر سکتی ہے۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے مودودی صاحب نے فرمایا:۔

"شرعِ اسلامی نے جس طرح مرد کو یہ حق دیا ہے کہ جس عورت کو وہ ناپسند کرتا ہے اور جس کے ساتھ وہ نباہ نہیں کر سکتا اسے طلاق دیدے، اسی طرح عورت کو بھی یہ حق دیا ہے کہ جس مرد کو وہ ناپسند کرتی ہو اور کسی طرح اس کے ساتھ گزر بسر نہ کر سکتی ہو، اس سے خُلع حاصل کر لے۔" (ایضاً ص ۶۰)

عائلی قوانین میں عورت کے اس حق کو تسلیم کیا گیا ہے!

علماء کو ڈانٹ

مودودی صاحب نے جب عائلی قوانین کے بارے میں ان خیالات کو پیش کیا تو قدامت پسند علماء نے ان پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا، لیکن مودودی صاحب نے ان کی ناپسندیدگی کی کوئی پرواہ نہ کی، بلکہ مندرجہ ذیل الفاظ میں انہیں سخت ڈانٹ پلائی:۔

"قیامت کے روز حق تعالےٰ کے سامنے، ان گنہگاروں کے ساتھ ساتھ ان کے دینی پیشوا بھی پکڑے ہوئے آئیں گے اور اللہ تعالےٰ ان سے پوچھے گا کہ کیا ہم نے تم کو علم و عقل

سے اس لئے سرفراز کیا تھا کہ تم اس سے کام نہ لو، کیا ہماری کتاب اور ہمارے نبی کی سنت تمہارے پاس لئے تھی کہ تم اس کو لئے بیٹھے رہو اور مسلمان گمراہی میں مبتلا ہوتے رہیں، ہم نے اپنے دین کو آسان بنایا تھا۔ تم کو کیا حق تھا کہ اسے مشکل بنادو، ہم نے تم کو قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا حکم دیا تھا۔ تم پر یہ کس نے فرض کیا کہ ان دونوں سے بڑھ کر اپنے اسلاف کی پیروی کرو۔ ہم نے ہر مشکل کا علاج قرآن میں لکھا تھا، تم سے یہ کس نے کہا کہ قرآن کو ہاتھ نہ لگاؤ اور اپنے لئے انسانوں کی لکھی ہوئی کتابوں کو کافی سمجھو۔ اس باز پرس کے جواب میں امید نہیں کہ کسی عالم دین کو کنز الدقائق اور ہدایہ اور فتاویٰ عالمگیری کے مصنفوں کے دامن میں پناہ مل سکے۔"

(ایضاً)

عائلی زندگی سے متعلق قرآن و سنت سے راہنمائی کے لئے علامہ غلام احمد پرویزؒ کی کتب "طاہرہ کے نام" "قرآنی قوانین اور تبویب القرآن" کے علاوہ سنگِ میل پبلیکیشنز کی شائع کردہ جناب رفیع اللہ شہاب صاحب کی کتاب "اسلام کا ازدواجی نظام" کا مطالعہ قارئین کے لئے مفید ہو سکتا ہے۔

بشیراں عابدہ ، سعودی عرب

باسمہٖ تعالیٰ

اَنِّیْ لَاۤ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی بَعْضُکُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ

تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے!

آدھی انسان

قرآن کریم میں ارشاد ہے کہ انسان کے انفس و آفاق میں ایسی تبدیلیاں رُونما ہوتی رہیں گی، جن سے یہ تسلیم کرے گا کہ جو بات خدا نے کہی تھی — واقعی سچ تھی!

سَنُرِیْهِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْۤ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (۴۱/۵۳)

اس ضمن میں محترم باباجیؒ کہا کرتے تھے کہ ہم قرآن کریم کے حقائق کو دلائل و براہین کی رُو سے پیش کرتے ہیں، لیکن یہ نہیں مانتے۔ ٹھیک ہے نہ مانیں! وقت کے بے رحم ہاتھ خود ہی ان سے تسلیم کروالیں گے۔ عورت کے حقوق و فرائض سے متعلق قرآنی حقائق کو آپ نے جس خوب صورت اور دلنشین انداز میں پیش کیا اس سے قرآنی معاشرت میں عورت کو جو باعزت اور بلند مقام حاصل ہے، وہ نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔ لیکن عورت کے بارے میں ہمارے علماء اکرام نے جو فتوے صادر کر رکھے ہیں، مثلاً یہ کہ عورت کم عقل ہے، یہ جذباتی ہو جاتی ہے، فیصلے صحیح نہیں کر سکتی، کمزور ہے، مرد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات نہیں کر سکتی، کام کاج کیلئے ناموزوں اور حکمرانی کے لئے تو قطعی ناموزوں، مرد اس کا حاکم اور یہ اس کی غلام حتیٰ کہ ایک مرد برابر ہے دو عورتوں کے! یہ اور اس قسم کے دیگر دلائل پڑھ پڑھ کر دماغ بوجھل ہو جاتا۔ مرد کے برابر عورت کی یہ حالتِ زار دیکھ کر نگاہیں بار بار آسمان کی طرف اٹھتیں۔ بار الٰہا! کب تیری تائید و نصرت شامل حال ہوگی؟ کب ان حضرت پر واضح ہوگا کہ مرد اور عورت کا رشتہ حاکم و محکوم کا نہیں۔ یہ تو طاغوتی نظام کا خاصہ ہے، جہاں مرد اور عورت تو ایک طرف معاشرے میں ہر فرد دوسرے فرد کا محکوم ہوتا ہے۔ خدا کے نظام کی بنیاد تو یہ ہے کہ خواہ کوئی کتنا ہی مقتدر کیوں نہ ہو، اطاعت صرف خدا کے حکم کی ہوگی۔ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰهَ ...... (۱۱/۲) اور اس نظام میں شریک خواہ مرد ہوں یا عورتیں۔ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ۔ ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ بجائے ایک فرد

...قوتی کو دبا کر رکھے، کمزور کم عقل اور جاہل قرار دے وہ ایک دوسرے کے مضبوط بازو بنتے ہیں بَعْضُهُمْ
...بَعْضٍ - ان کا رشتہ دوستی اور باہمی رفاقت کا ہوتا ہے۔ (۹/۷۱)

...الہا! تونے ہمارے آفاق میں تو ان گنت نشانیاں دکھلا دیں اور دکھلا رہا ہے۔ اندرا گاندھی کو ہندوستان ...تمکنت عطا کر کے ہندو دھرم کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ گولڈا ائیر کو یہودیوں پر مسلط کر کے تورات ...انسانوں کا بھانڈا پھوڑا، اور عیسائیت جس نے عورت کو گناہ کی پوٹلی بنا رکھا تھا۔ آج کوری اکینو اور مارگریٹ تھیچر ...قدموں تلے سسک رہی ہے۔ تیسرے اس قول کی صداقت کسی بھی انسان کی محتاج بیان نہیں رہی کہ۔ اَنِّیْ لَا ...اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ۚ ہم تم میں سے کسی کے عمل کو بھی ضائع ...نہیں ہونے دیتے۔ خواہ مرد ہو یا عورت۔ ہماری نگہ میں تم سب برابر ہو۔ (۳/۱۹۴) - تیری یہ کھلی کھلی نشانیاں دیکھ ...لینے کے باوجود، ہم مسلمانوں کا ملّا آج بھی وہیں کھڑا ہے جہاں یہ ہزار بارہ سو برس پہلے تھا۔ اور تیرے اس ...فرمان کا "اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ" بدستور غلط ترجمے اور تفسیریں بیان کر رہا ہے۔ یہ بضد ہے ...کہ مرد، عورتوں پر حاکم ہیں" اور اپنے اس فتوے پر چٹان کی طرح قائم ہے۔ بارالہا! اس کے اپنے معاشرے میں ...کوئی ایسی نمایاں تبدیلی پیدا کر جو اسے جھنجوڑ کر رکھ دے۔ اس کی آنکھیں کھلیں اور معلوم ہو کہ "قوامون" کا معنی حاکم نہیں ہوتا اور نہ ہی اس آیۂ کریمہ کی وہ تفسیر ہے جو یہ بیان کرتا پھرتا ہے!

عزیزانِ گرامی! مجھے قرآنِ کریم کے مذکورہ بالا دعوے میں تو کبھی شک نہیں ہوا، البتہ خدا کی محسوس نشانیوں کے ظاہر ہونے میں جو وقفۂ انتظار ہوتا ہے، اس کی سکت نہ پاکر کبھی کبھی دل اداس ہو جاتا ہے۔ آپ میں سے جو قرآنِ کریم کے طالب علم ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ خدا کی اسکیموں کو پایۂ تکمیل تک پہنچنے کیلئے کتنی طویل مدت درکار ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی آپ کو انسان کی عجلت پسند طبیعت کا بھی علم ہے۔ ہماری یہ کیفیت ہوتی ہے کہ اگر اپنی آرزوں کے بارآور ہونے کی ہلکی سی بھی جھلک دکھائی دیدے تو سمجھ بیٹھتے ہیں کہ اب کام تمام ہوا۔ محترمہ بے نظیر کی شاندار کامیابی سے اطمینان ہوگیا تھا کہ بارگاہِ ایزدی میں میری اور میرے ساتھ لاکھوں بہنوں کی صدیوں سے کچلی آرزوؤں اور نامکمل تمناؤں کی تکمیل کا وقت آن پہنچا۔ لاکھوں ملاؤں کی دعائیں مسترد ہوئیں۔ مسلمانوں کی ایک اکثریت نے مکمل آزادانہ طور پر ایک خاتون کی صلاحیتوں پر اپنے اعتماد کا ووٹ دیا۔ اور محترمہ ملک کے اعلیٰ ترین منصب پر نہایت وقار سے متمکن ہوگئیں۔ خیال تھا کہ اب ان کے منہ بند ہو جائیں گے اور عورت کے مقام اور صلاحیتوں کے ضمن میں انہوں نے احکام خداوندی کی جو تاویلیں اور تفسیریں بیان کر رکھی ہیں، انہیں درست کرلیں گے۔ قومی الیکشن اور ان کے بعد تحریکِ عدم اعتماد میں ہماری مذہبی سیاسی جماعتوں کو جس بری شکست کا سامنا ہوا تھا۔ اس کے پیشِ نظر عورت کے مقام و صلاحیت کے خلاف ہمارے علماء کی زبان پر حرف تک نہیں آتا

چاہیئے تھا۔ عورت اپنے مقام اور صلاحیت کا زندہ ثبوت بن چکی تھی۔ لیکن لگتا ہے کہ یہ طمانچے کافی نہیں! ملاؤں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لئے قدرت کی کوئی اور ہی تدبیر ہے۔ مُلّا بدستور چلّا رہا ہے۔ عورت نا اہل ہے، کمزور ہے، آدھی ہے!!

عزیزانِ گرامی! قرآن کریم کی تعلیمات کے مطابق عورت کو جو مقام حاصل ہے اس کی تشریح کے لئے تو پوری کتاب چاہیئے۔ کیونکہ اس کی گود میں ایک امّت تشکیل پاتی ہے، اور یہ امّت کی مجموعی کارکردگی کا انڈکس ہوتی ہے یعنی جیسی ماں ویسی امّت۔ اور امّت کی حالت دیکھ کر بتایا جاسکتا ہے کہ اس کی ماں کی حالت کیسی ہوگی؟ میں اس موضوع پر زیادہ بحث نہیں کروں گا۔ اس لئے کہ اس ضمن میں منجملہ دیگر صاحبانِ علم و بصیرت، جو دلائل و براہین محترم پرویز صاحبؒ نے پیش کئے ہیں، میں ان سے بہتر ترجمانی نہیں کرسکتا۔ مجھے اپنی بے بضاعتی اور کم مائیگی کا پورا پورا احساس ہے۔ البتہ ہمارے علماء اکرام نے جو فتوے صادر کر رکھے ہیں ان کا بھرپور جائزہ لوں گا۔ ہمارے معاشرے میں عورت کی جو حالتِ زار ہے اس کا بنیادی سبب انہی حضرات کی پھیلائی ہوئی نفرت ہے۔

آپ نے آج تک کسی بھی مفکر، دانش ور، شاعر، ادیب یا صحافی کو عورت کے خلاف نہیں سنا ہوگا۔ کسی نے نہیں کہا کہ عورت نا اہل ہے، کمزور ہے، کم عقل ہے، آدھی ہے یا پونی ہے! عورت کے خلاف جتنی زہر افشانی ہوتی ہے وہ انہی حضرات کے محراب و منبر سے ہوتی ہے۔ اس لئے ہم نے بھی تہیہ کر رکھا ہے کہ اس وقت تک قلم نہیں چھوڑیں گے جب تک کہ عورت کے خلاف ان کی آخری دلیل بھی دم نہیں توڑ دیتی۔ ہم ان سے فاتحہ پڑھوا کر ہی دم لیں گے!

عورت کے خلاف ہمارے علماء کے فتووں کی فہرست تو بہت طول طویل ہے، لیکن میں ان میں سے صرف چند ایک کو لونگا۔ بالخصوص وہ جنہیں یہ اکثر و بیشتر دہراتے رہتے ہیں۔ بقول ان کے، مرد اور عورت کی صلاحیتوں میں فرق ہے۔ لہٰذا ان میں مساوات قائم نہیں ہوسکتی۔ مرد، عورتوں سے افضل ہیں۔ مرد عورتوں پر حاکم ہیں۔ حالت اضطراری کے سوا عورت اکتساب رزق نہیں کرسکتی۔ عورت کی قانونی حیثیت آدھی ہے۔ جذباتیت اور نسیان اس کی فطرت ہے، لہٰذا اسے کوئی بھی اہم ذمہ داری نہیں سونپی جاسکتی۔ مرد کیلئے اس میں کشش، جاذبیت اور زیب و زینت کے بہت سامان ہیں اور اندیشہ ہے کہ سرِعام آنے سے مردوں کا ایمان ضائع ہوجائے، لہٰذا ستر و حجاب کے جملہ قوانین اس پر لاگو ہوتے ہیں اور ان کی رُو سے یہ گھر سے باہر قدم نہیں رکھ سکتی۔ ان فتووں کی تائید میں قرآن کریم کی جن آیات کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ ان کی حقیقی غرض و غائت تو ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔ پہلے یہ دیکھتے جائیے کہ خدا کے نظام میں مجموعی طور پر جو اختصاص و امتیاز پایا جاتا ہے اس کی غرض و غائت کیا ہے۔؟ عورت اور مرد کے درمیان صلاحیتوں کے فرق کو سمجھنے کیلئے، اسے سمجھنا ضروری ہے۔

ہمارا عام مشاہدہ ہے کہ کائنات کی ہر شئے میں ماہیت، نوعیت اور کیفیت کے اعتبار سے ایک فرق پایا جاتا ہے۔ سورج اور چاند میں فرق، سیاروں اور ستاروں میں فرق، ارض و سموٰت میں فرق، حیوانات میں فرق، نباتات میں فرق وغیرہ وغیرہ۔ حقیقت یہ ہے کہ اشیاء کا یہی باہمی فرق ہے جس کی بدولت پوری کائنات رواں دواں ہے۔ اگر یہ فرق نہ ہوتا، ہوائیں رُک جاتیں۔ پانی ٹھہر جاتے۔ روشنی سفر نہ کر سکتی۔ زمین ساکن ہو جاتی اور زندگی فنا ہو جاتی۔ لیکن اس فرق و تفریق کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ اس پوری کائنات میں ایک توازن پایا جاتا ہے۔ اَلَّا تَطْغَوْا فِی الْمِیْزَانِ (۵۵/۸)۔ کوئی اعلیٰ کسی ادنیٰ کا استحصال نہیں کر رہا ہے۔ بلکہ صورتِ حال یہ ہے کہ ہر شئے اپنے دائرۂ کار میں ایک طرف اور کائنات کی مجموعی کارکردگی میں دوسری طرف، نہایت حسن کارانہ انداز میں عمل پیرا ہے۔ وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ یَسْجُدَانِ (۵۵/۶) کائنات میں تفریق کے باوجود توازن قائم رکھنا خدا کی قوت و حکمت کا شاندار مظاہرہ ہے۔ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (۵۵/۱۳) لیکن اس ساری کارگہ کائنات میں انسان ایک استثناء ہے۔ اسے اختیار و ارادہ دیا گیا تھا اور تفریق کے باوجود ایسا توازن اس نے خود اپنی منشاء کے مطابق قائم کرنا تھا، اور اس مقصد کے لئے اسے راہنمائی پہنچا دی گئی تھی۔ وَاَقِیْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِیْزَانَ (۵۵/۹) کائنات کی مجموعی کارکردگی میں اس کا کیا کردار ہے۔ اس سے قطع نظر جہاں تک اس کے دائرۂ عمل کا تعلق انسانوں سے ہے، وہاں اس کا بُرا حال ہے۔ تخصیص و امتیاز کو بنیاد بنا کر اس نے اپنی معاشرت میں وہ خونریزیاں اور فسادات برپا کئے کہ الامان! اس کی تاریخ کا بیشتر حصہ ایسے ہی کارناموں کا مرقع ہے۔ اعلیٰ خاندان، اعلیٰ نسل، اعلیٰ شخصیت، غرضیکہ کسی بھی صفت میں اگر یہ اعلیٰ رہا ہے تو اپنے اس علو و مرتبت کو نوعِ انسان کے مفاد میں استعمال کرنے کی بجائے، اس نے ہمیشہ اپنے سے کمتر اور کمزور انسانوں کو کچلنے میں استعمال کیا ہے۔

انسانی معاشرے میں جتنی برائیاں پائی جاتی ہیں۔ اگر ان کا تجزیہ کیا جائے تو ان کا جذبۂ محرکہ انسان کی اسی خصلت میں ملے گا۔ یعنی اپنے آپ کو بڑا سمجھنا اور دوسروں کو حقیر بنانے کی کوشش کرنا۔ انسان کے اس جذبہ کی پست ترین کارفرمائی کی جھلک مرد اور عورت کے باہمی تعلقات میں ملتی ہے۔ چہ جائیکہ عورت کسی صفات میں اپنا ثانی نہیں رکھتی، لیکن یہاں مردوں نے فرض کر رکھا ہے کہ وہ عورتوں سے افضل ہیں۔ قرآن کریم نے مردوں کے اس مغالطے کے ضمن میں کہا۔ تم میں مرد اور عورت کی تخصیص تو بعد میں ہوئی تھی۔ پہلے اپنی اصل کو دیکھو۔ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ (۴/۱) اصل کے اعتبار سے تم دونوں ایک ہو (۴/۱) اور پھر پوری نوعِ انسان کو مخاطب کر کے فرمایا۔ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ۔ اے نوعِ انسان! اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی۔ ہم نے تمہیں مرد اور عورت کے اختلاط سے پیدا کیا۔ ہر انسانی بچے میں مرد اور عورت کا حصہ ہوتا ہے۔ وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا

وَّقَبَآئِلَ ۔ اور اس کے بعد تمہیں مختلف خاندانوں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا۔ اس سے مقصد تھا ۔ لِتَعَارَفُوْا تمہیں ایک دوسرے کو پہچاننے میں آسانی ہو، اور تمہارا کاروبارِ زندگی رواں دواں رہے۔ ورنہ نہ کوئی مرد کسی عورت سے اور نہ کوئی قبیلہ دوسرے قبیلے سے افضل ہے۔ عزت و تکریم کا صرف ایک معیار ہے اور وہ یہ کہ۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ۔ تم میں سے جس کی زندگی زیادہ سے زیادہ قوانینِ خداوندی کے مطابق ہوگی، وہی سب سے زیادہ واجب التکریم ہے ۔ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ ۔ یاد رکھو! یہ بات وہ کہہ رہا ہے جو اچھی طرح جانتا ہے کہ فضیلت کسے کہتے ہیں اور وہ کس طرح پیدا ہوتی ہے (۴۹/۱۳)۔

نوعِ انسان کی اجتماعی تفریق و امتیاز کے علاوہ انسان انفرادی خصوصیات کے لحاظ سے بھی مختلف ہوتے ہیں۔ ہر انسان صلاحیت، کارکردگی، مزاج اور دیگر اوصاف میں دوسرے انسان سے مختلف ہے۔ صلاحیتوں کا یہ فرق انسانوں میں باہمی ربط و تعاون کا ذریعہ بنتا ہے، اور یہی انسان کی تمدنی زندگی کی بنیاد ہے۔ انسان اور حیوان میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ انسان ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے ہیں جبکہ حیوان ایسا نہیں کر سکتے۔ ایک گائے کو نہ تو کسی مزدور کی، نہ ڈاکٹر کی اور نہ ہی کسی وکیل کی حاجت ہوتی ہے۔ صلاحیتوں کا فرق انسان کے شرف و امتیاز کی علامت ہے اور اگر انسان نے اسے برقرار رکھنا ہے تو اسے اس فرق کے باوجود امّتِ واحدہ بن کر رہنا ہوگا اس کے متعلق فرمایا! وَلَوْ شَآءَ اللّٰہُ لَجَعَلَکُمْ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً ۔ خدا تمہیں اپنی مشیت کیمطابق امّتِ واحدہ بنا کر رکھ سکتا تھا۔ لیکن اس طرح تمہارا شرف و امتیاز ختم ہو جاتا ۔ وَلٰکِنْ لِّیَبْلُوَکُمْ فِیْ مَآ اٰتٰکُمْ ۔ لہٰذا اس کا تقاضا تھا کہ جو صلاحیتیں تمہیں عطا ہوئی ہیں ان کی آزمائش ہو۔ تزاحمات و تصادمات سے تمہارا قدم قدم پر ٹکراؤ ہو۔ ان پر قابو پانے سے ہی معلوم ہوگا کہ تم ہماری کتنی شاندار تخلیق ہو۔ لہٰذا اس ضمن میں کرنے کا کام یہ ہے کہ۔ فَاسْتَبِقُوا الْخَیْرٰتِ ۔ تم ایسے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لو جو تم سب کے لئے خیر و برکت کا موجب ہوں۔ جو تم سب کی صلاحیتوں میں اضافے کا باعث ہوں۔ (۵/۴۸)

عزیزانِ گرامی آپ نے دیکھا کہ قدرت نے جو فرق و امتیاز پیدا کیا اس کی غرض و غائت کیا تھی؟ کاروانِ انسانیت کو رواں دواں رکھنے کے لئے یہ فرق کسقدر ضروری تھا؟ عورت اور مرد کے ضمن میں تو یہ مزید اختیار کر جاتا ہے کیونکہ یہ دونوں نسلِ انسانی کی بقا اور امن و سلامتی کے ضامن ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے دونوں کو منفرد صلاحیتیں عطا کی گئی ہیں۔ ان صلاحیتوں کو باہمی تعاون اور خلوص و محبت سے بروئے کار لانا ہے۔ اگر یہ ایسا نہیں کریں گے تو اپنے مقصد کو خوش اسلوبی سے سرانجام نہیں دے پائیں گے۔ لیکن اس حقیقتِ باہرہ کے بالعکس ہمارے علمائے اکرام کا ارشاد ہے کہ جو فرق خدا نے خود پیدا کر رکھا ہے اسے نہیں مٹانا چاہئے ۔ گناہ ہوتا ہے! یہ حضرات مرد اور عورت کی مساوات کے قطعی قائل نہیں۔ جب تک حالات ان کے موافق رہے انہوں نے اپنے اس رویئے میں

تبدیلی پیدا نہیں کی۔ لیکن کب تک! فطرت تو اپنے مقاصد کی تکمیل میں مصروف ہے۔ حالات کو بدستور
تبدیلیاں دے رہی ہے، اور یوں ہر چیز اس سے قریب تر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ عورت سے متعلق حالات
بھی کافی بدل چکے ہیں۔ ان بدلتے ہوئے حالات کے تحت، اب یہ حضرات اتنا تو تسلیم کرنے لگے ہیں کہ دینی، مذہبی
اور اخلاقی لحاظ سے مرد اور عورت مساوی ہیں، لیکن قانونی اعتبار سے ابھی بھی یہ عورت کو آدھا ہی سمجھتے ہیں۔ ہمیں
ان کی اس جدید منطق کی سمجھ نہیں آ پا رہی۔ یہ تو ہم جانتے ہیں کہ یہ حضرات زندگی کے ہر معاملے میں ثنویت کے متشدد
پرچاری ہیں۔ لیکن ایسی بھیانک قسم کی ثنویت ہم نے آج تک نہیں سنی۔ ہمارے نزدیک دین اور قانون میں کوئی فرق نہیں
ہونا چاہیئے۔ دین دراصل قوانین ہی کے مجموعے کا نام ہوتا ہے۔ اگر کوئی چیز دین کی رُو سے جائز ہے تو لامحالہ وہ قانون کی رُو
سے بھی جائز ہوگی۔ اگر عورت دینی اعتبار سے مرد کے مساوی ہے تو اسے قانون کی رُو سے بھی مرد کے مساوی ہونا چاہیئے۔

قرآن کریم ہمارا دین ہے، ہمارا قانون ہے، ہمارا ضابطۂ حیات ہے اور یہ اس خدا کا عطا کردہ ہے کہ جس نے
حیوانوں کیلئے بھی کوئی ایسا ماحول نہیں بنایا جس سے مونث و مذکر میں سے کسی ایک فریق کی سبکی ہوتی ہو۔ ہم تصور بھی
نہیں کر سکتے کہ اسی خدا نے کوئی ایسا قانون دیا ہو جس سے عورت کے مرتبے میں کسی بھی لحاظ سے کمی ہوتی ہو، بلکہ
حقیقت تو یہ ہے کہ قرآن کریم نے عورت کے لئے ایسے قانونی استحقاق بھی قائم کئے جن کا اس سے پہلے دنیا
میں تصور تک نہ تھا اور جن میں سے بعض کے متعلق آج بھی دنیا کی مہذب ترین اقوام تک نابلد ہیں۔ قرآن کریم کے جملہ
قوانین میں صرف ایک مقام ایسا ہے جہاں عورت کو شبہ ہو سکتا ہے کہ مرد کے مقابل اسے ایک زائد پابندی کا مکلف
ٹھہرایا جا رہا ہے۔ میں نے شائبہ اس لئے کہا کہ ابھی تک ہمارا علم اس قابل نہیں ہوا کہ اس پابندی کی حقیقی غرض و غایت
کا تسلی بخش جواب دے سکے۔ جس دن بھی ایسا ہو گیا، عورت کا یہ شائبہ بھی رفع ہو جائے گا۔ اور وہ اس پابندی کو
اپنے لئے ایک نعمت تصور کرے گی۔ یہ پابندی "عدت" سے متعلق ہے جس سے مرد کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔
قرآن کریم کی جس آیہ کریمہ میں اس پابندی کا ذکر ہے۔ اللہ تعالےٰ نے ٹھیک اسی مقام پر اس بات کی بھی وضاحت
کر دی کہ۔ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ط اے قوانین کے علمبردارو! ہمارے قانونِ عدت کی رُو سے مرد کو عورت
پر جو ایک درجہ فضیلت حاصل ہو رہی ہے۔ اسے ہم نے خود تسلیم کر لیا ہے۔ اب ایسا نہیں ہونا چاہیئے کہ تم
بیٹھ کر اس کے پیچھے پڑ جاؤ۔ جہاں تک زندگی کے دوسرے امور کا تعلق ہے تو یہ مرد کے دوش بدوش ہے۔
وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ..... (۲/۲۲۸)

ہمارے شرعی قوانین کے علمبردار خدا کی اس بیّن وضاحت کو آج تک نہیں سمجھ پائے۔ شاید سمجھنے کی کوشش
نہیں کرتے۔ ان کا خیال ہے کہ صرف عدت کے معاملے ہی میں نہیں بلکہ زندگی کے ہر معاملے میں مرد کو عورت
پر ایک درجہ فضیلت حاصل ہے۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ خدا کے نزدیک فضیلت کا معیار کیا ہے؟ خدا نے ہر

انسان کو کچھ مخصوص صلاحیتیں دے رکھی ہیں۔ ان صلاحیتوں میں کمی بیشی کسی بھی امتیاز کا باعث نہیں ہوتی۔ خدا کے ہاں فضائل کا موجب ان صلاحیتوں کا صحیح استعمال ہوتا ہے۔ اس کے مطابق ایک انجینئر اور مزدور میں سے افضل وہ ہوگا جو اپنی صلاحیت کو نہائت دیانت اور خلوص سے بروئے کار لائے گا۔ مرد اور عورت کے ضمن میں بھی یہی اصول کارفرما ہے۔ قدرت نے ان دونوں کو سب صلاحیتیں یکساں عطا کی ہیں۔ ان کی کارکردگی (Performance) میں فرق ہو سکتا ہے لیکن جہاں تک بنفسہٖ صلاحیت کا تعلق ہے، اس کی رُو سے مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں۔ قرآنِ کریم نے اس روشن حقیقت کی تصدیق ان الفاظ میں کی ہے:

إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ

قوانینِ خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے اور ان کی صداقت پر ایمان رکھنے کی صلاحیت مرد اور عورت دونوں میں ہے

وَالْقَانِتِينَ وَالْقَانِتَاتِ وَالصَّادِقِينَ وَالصَّادِقَاتِ

اسی طرح اپنی صلاحیتوں کے صحیح استعمال اور خدا کے ساتھ اپنے عہد و پیمان کو سچ کر دکھانے کی صلاحیت میں بھی دونوں یکساں ہیں۔

وَالصَّابِرِينَ وَالصَّابِرَاتِ

نظامِ خداوندی کی راہ میں حائل مشکلات اور مصائب کے مقابلہ میں ثابت قدم اور مستقل مزاج رہنے کی صلاحیت درکار ہوتی ہے۔ یہ صلاحیت بھی مرد اور عورت دونوں میں موجود ہے

وَالْخَاشِعِينَ وَالْخَاشِعَاتِ وَالْمُتَصَدِّقِينَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ

نوعِ انسان کی خدمت میں شارعِ فردار کی طرح ہمہ وقت جھکے رہنا اور اپنی ہر متاع کو نظامِ خداوندی پر نچھاور کر دینا بھی ایک صلاحیت ہے۔ مرد اور عورت دونوں اس صلاحیت سے سرشار ہیں۔

وَالصَّائِمِينَ وَالصَّائِمَاتِ وَالْحَافِظِينَ فُرُوجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ۔

معمولی سے معمولی حکمِ خداوندی کا پابند رہنا اور اپنی عفت و عصمت کی پوری پوری حفاظت کرنا ایک نہائت نہائت ہی نایاب صلاحیت ہے۔ خدا نے مرد اور عورت دونوں کو اس سے نوازا ہے۔

وَالذَّاكِرِينَ اللَّهَ كَثِيرًا وَالذَّاكِرَاتِ

اور یہ صلاحیت کہ زندگی کے ہر قدم پر، ہر موڑ پر، ہر گوشے میں قوانینِ خداوندی کو شدت سے سامنے رکھا جائے۔ عورتیں، مردوں سے کسی بھی طرح کم نہیں۔

أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا (۳۳/۳۵)

برابر ایں، خدا کے قانون میں دونوں کے لئے حفاظت کے سامان ہیں اور دونوں کی سعی و عمل کا اجرِ عظیم ملے گا۔ بالکل برابر، برابر!!

ہمارے علماء، مرد اور عورت کی صلاحیتوں میں مذکورہ بالا مساوات کے تو قائل ہیں۔ لیکن سمجھتے ہیں کہ ایسا خدائی نظام قائم ہوگا اور چونکہ خدا کا نظام ان کی موجودگی میں کبھی قائم نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا، ایسی مساوات کی توقع آخرت میں رکھنی چاہیئے جہاں تک اس دنیا کا تعلق ہے تو اس کے متعلق ان کا فرمان ہے کہ بالفرض مرد اور عورت میں کوئی برابر کی صلاحیت پائی بھی جاتی ہے تو عورت کو اس کا استعمال سوچ سمجھ کر کرنا چاہیئے۔ اس سے مراد ان کی من گھڑت شریعت ہوتی ہے عورت کو کوئی کام بھی شرعی قوانین سے ورے نہیں کرنا چاہیئے۔ مثلاً اکتسابِ رزق کی صلاحیت کے متعلق ان کا فرمان ہے کہ جب تک "حالتِ اضطراریہ" نہ ہو عورت کو اپنی اس صلاحیت کا استعمال نہیں کرنا چاہیئے۔ ہم نے ان کی اس اصطلاح پر بھی کافی غور و خوض کیا ہے لیکن کچھ پلے نہیں پڑا کہ حالتِ اضطراری سے ان کی کیا مراد ہے؟ کیونکہ ہمارے مشاہدے کے مطابق جو گھرانے خوشحال اور متمول ہوتے ہیں ان کی عورتیں تو ایک طرف، مرد بھی کام کاج نہیں کرتے! ہمارے معاشرتی نظام میں خواہ عورت ہو یا مرد سبھی بحالتِ مجبوری رزق کے لیئے محنت و مشقت کرتے ہیں۔ (قرآنی نظام کی اور بات ہوگی) حالتِ اضطراری سے مراد شاید ان کا پرمٹ ہو! کہ جب تک کوئی عورت ان سے ورک پرمٹ حاصل نہ کرلے وہ اکتسابِ رزق نہیں کرسکتی۔ بہرحال یہ یاد رہے کہ رزق انسانی زندگی کی بنیاد ہے۔ انسان میں دیگر صلاحیتیں اگر نشوونما نہ بھی پاسکیں تو بھی کاروبارِ حیات چلتا رہتا ہے۔ لیکن یہ صلاحیت دب جائے تو زندگی بُری طرح متاثر ہوتی ہے۔ رزق کے بغیر کوئی انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ رزق کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر اللہ تعالےٰ نے اکتسابِ رزق کے بارے میں نہایت واضح ہدایات دی ہیں، کہا:

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ

رزق کے معاملے میں تمہیں ایک دوسرے پر جو فضیلت حاصل ہے اسے اپنے جذبات کی تسکین کا ذریعہ نہ بنالینا۔ اکتسابِ رزق کے سلسلے میں ہمارے اس اصول کو ہمیشہ مدِنظر رکھنا،

لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ

جو کچھ مرد کمائے وہ اس کا حصّہ اور جو کچھ عورت کمائے وہ اس کا حصّہ۔ اکتسابِ رزق رزق کی صلاحیت سب میں یکساں ہے لہٰذا سب کو چاہیئے،

وَسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ

کہ خدا سے زیادہ سے زیادہ معاشی اکتساب کی توفیق طلب کریں خدا خوب جانتا ہے کہ تم میں سے ہر ایک کیا کچھ کرسکتا ہے؟

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا (۴/۳۲)

مرد اور عورت کے جداگانہ حقوقِ ملکیت کا فطری تقاضا تھا کہ مرنے والے کے ترکہ میں ان دونوں کا حصّہ ہو چنانچہ اس ضمن میں فرمایا :-

وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْأَقْرَبُونَ ط

جو کچھ کسی کے والدین یا اقربا چھوڑ جائیں، ہم نے اس کے لئے حصّہ دار مقرر کر دیئے ہیں۔

ان میں عقدی رشتوں کے متعلق فرمایا :-

وَالَّذِينَ عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ فَآتُوهُمْ نَصِيبَهُمْ (۴/۳۳)

ترکہ میں عقدی رشتوں کا حصّہ بھی شامل ہے جو کہ انہیں ملنا چاہیئے۔

بلکہ احوال یہ ہے کہ عقدی رشتہ داروں کا حصّہ نکال کر پھر نسبی رشتہ داروں کے حصّے تقسیم کئے جائیں اس طرح بیوہ کو مرحوم خاوند کے ترکہ میں سب سے پہلے حصّہ ملے گا۔ مرد اور عورت کے فطری فرائض میں تفاوت ہے جن کی بناء پر عورت بیشتر وقت کے لئے کسبِ معاش سے معذور ہو جاتی ہے۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ عورت کو بجائے مرد کی عنائت یا ترحم خسروانہ پر چھوڑا جائے، اسے قانون کی رُو سے تحفظ فراہم کیا جائے تاکہ وہ کسی بھی احساسِ کمتری میں مبتلا ہوئے بغیر اپنے فرائضِ فطری خوش اسلوبی سے سرانجام دے سکے۔

اس ضمن میں فرمایا :

اَلرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَا أَنْفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ ط

عورتوں کے سپرد جو ذمہ داریاں ہیں مرد انہیں قطعی سرانجام نہیں دے سکتے۔ اس طرح عورتیں مردوں سے کئی گنا افضل ہیں۔ لیکن ان فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں عورتیں کچھ عرصہ کے لئے اکتسابِ رزق سے معذور ہو جاتی ہیں اور انکی کفالت مردوں کو کرنا پڑتی ہے۔ اس طرح مردوں کو کچھ فضیلت حاصل ہو جاتی ہے عورت اگرچہ اپنی معذوری کے دوران بھی رزق کا اہتمام کر سکتی ہے، لیکن اس کے فرائض کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ اس دوران اسے مکمل فراغت اور ذہنی آسودگی حاصل ہونی چاہیئے۔ لہٰذا خدا کا قانون یہ ہے کہ عورتوں کی کفالت بنیادی طور پر مردوں کے ذمہ ہوگی۔ یہ عورتوں کا قانونی استحقاق ہے (AS OF RIGHT)۔ اس سے مردوں کو کوئی فوقیت حاصل نہیں ہو جاتی۔ اس لئے کہا :

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ط

عورتوں کو چاہیئے کہ انہیں جو مضمر صلاحیتیں عطا ہوئی ہیں ان کی حفاظت کریں اور (جب تک کوئی خاص عذر لاحق نہ ہو) اس مقصد کو پورا کریں جس کے لئے وہ صلاحیتیں دی گئی ہیں اور یوں قانونِ فطرت کی اطاعت کریں.... (۴/۳۴)

واضح رہے کہ قرآن کریم میں مندرجہ بالا آیات تسلسل سے آئی ہیں ان سے پہلے کی بھی چند آیات رزق کے معاملے ہی سے تعلق رکھتی ہیں۔ ہمارے علماء نے ان پر بڑی لمبی چوڑی بحثیں کی ہیں۔ بالخصوص، کسب، نصیب اور فضل کے الفاظ پر۔ کسب اور

کے متعلق ان کا خیال ہے کہ یہ الفاظ نیکی کمانے کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ البتہ فضل کو یہ رزق ہی کہتے ہیں نے ان آیات کا جو عمومی مفہوم متعین کیا ہے، اس کے مطابق عورت صرف نیکی کما سکتی ہے۔ رزق نہیں! ن کے اس مفہوم سے جو اختلاف ہے۔ اس سے قطع نظر اتنی گذارش ضرور کریں گے کہ نیکی کا مفہوم خواہ کچھ سمجھی۔ خدا کے ہاں اس کا اجر بھی رزق ہی کی شکل میں ملے گا۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے:

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

جو لوگ ایمان لائے اور نیکیاں کمائیں، انہیں اس بات کی خوش خبری دے دو کہ

اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ

ان کے لئے ایسی جنت ہے کہ جس کی شادابی پر کبھی خزاں نہیں آئے گی۔

كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ

ان کا رزق ایسے پھل ہوں گے کہ جنہیں دیکھ دیکھ کر پکار اٹھیں گے ہم تو یہ پہلے بھی کھا چکے۔

وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا

ان کے نیک اعمال کا صلہ ایسے ہی رزق کی شکل میں بار بار ملے گا۔ (۲/۲۵)

خدا کے ہاں کسی کے نیک اعمال کے صلہ کی آخری شکل اگر رزق ہی ہے تو اسے اس دنیا میں اکتساب رزق سے کیوں منع کیا جائے۔ امید ہے کہ حضرات علماء اکرام ہماری اس گذارش پر غور فرمائیں گے اور عورتوں پر اکتساب رزق کی جو پابندی عاید کر رکھی ہے اس میں نرمی فرمائیں گے۔ بہر حال مندرجہ بالا آیات کریمہ میں یہ جو آیا ہے کہ، الرجال قوامون علی النساء۔ تو اس کا تعلق بھی علماء کے نزدیک رزق سے نہیں بلکہ حاکمیت سے ہے۔ یعنی مرد عورتوں پر حاکم ہیں۔ اور اس حکم کی حکمت یہ بیان فرماتے ہیں کہ "حکومتِ گھر" کا نظم و نسق چلانے کے لئے میاں کو بادشاہ اور بیوی کو وزیر مہر صورت بننا ہی پڑے گا۔ یہ دونوں بیک وقت بادشاہ کا رول ادا نہیں کر سکتے۔ بقول ان کے اس طرح گھر کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ جب یہ ایسا فلسفہ بیان کرتے ہیں تو لگتا ہے کہ ان کے ذہن میں مغلیہ دور کی کوئی مطلق العنان قسم کی بادشاہت ہوتی ہے جس میں جب ظلِ سبحانی کوئی حکم صادر کر دیتے تھے تو اس سے کسی کو بھی سرمو سرتابی کی مجال نہیں ہوتی تھی ہمارے علماء کے ذہن میں یہ بات سما ہی نہیں سکتی کہ قرآن کریم حکومت کا جو تصور دیتا ہے تو اس میں بادشاہ، وزیر، عوام سب حکم الٰہی کے تابع ہوتے ہیں۔ اور اس کی تعمیل باہمی مشاورت سے سرانجام پاتی ہے اس میں یوں نہیں ہوتا کہ ظلِ سبحانی کو اگر میٹھا نہیں پسند تو ساری مملکت میں میٹھے کے استعمال پر پابندی عاید کر دی جائے اور نہ ہی ایسا ہوتا ہے کہ ظلِ سبحانی تو بے لگام ساری مملکت

میں گھومتے پھریں اور وزیر بے چارہ محل کی چار دیواری میں ان کے کبوتروں کو دانہ ڈال رہا ہو۔ قرآن کریم ایک مربوط اور منظم گھر کا تصور ضرور دیتا ہے لیکن اس نظم وضبط میں مرد اور عورت دونوں کو برابر کا شریک ٹھہراتا ہے۔ ایک قرآنی گھرانے میں جملہ امور خدا کے قوانین کے تابع میاں بیوی کی باہمی مشاورت اور رضامندی سے طے پاتے ہیں (و امرھم شوریٰ بینھم کا اصول کارفرما ہے۔)

ہم گذشتہ سطور میں عرض کر چکے ہیں کہ ہمارے عصر حاضر کے علماء دینی و اخلاقی لحاظ سے مرد اور عورت کے مابین مساوات کو تسلیم کرتے ہیں لیکن قانونی اعتبار سے یہ بھی عورت کو آدھی پونی ہی سمجھتے ہیں۔ اس کے ثبوت میں قرآن کریم کے قانونِ وراثت اور قانونِ شہادت کو بطور شہادت پیش کرتے ہیں۔ قانونِ وراثت کے مطابق مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے۔ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ ۚ (۴/۱۱) ہماری قرآنی بصیرت کے مطابق تقسیم کا یہ اصول کسی بھی غیر مساویانہ سلوک یا نظریے کی بنیاد نہیں بن سکتا۔ اولاً، یہ کہ قرآن کریم کے اس اصول کا اطلاق عمومی صورتِ حال پر ہوتا ہے جو حصص قرآن کریم نے خود متعین کر دیئے ہیں ان میں کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی اور ان حصص کے مطابق ایک نہیں تین مقامات پر عورت کا مرد کے برابر حصہ مقرر کیا گیا ہے۔ مثلاً ماں باپ کے ضمن میں دونوں میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ (۱/۶) کلالہ (لاولد) کے بہن بھائی کے ضمن میں ہر ایک کو چھٹا حصہ (۱/۶) اور اگر کلالہ کے بہت سے بہن بھائی ہوں تو وہ سب ایک تہائی (۱/۳) میں برابر کے شریک ہوں گے۔ ثانیاً، اگر حصص میں ایسی مساوات نہ بھی ہو تب بھی مرد کا زاید حصہ عورت پر برتری کا سبب نہیں بن سکتا۔ وہ اس لئے کہ قرآنی معاشرت میں کنبہ کی کفالت کی ذمہ داری بنیادی طور پر مرد کے سپرد ہے۔ اس ذمہ داری کو خوش اسلوبی سے سرانجام دینے کے لئے، اضافہ کا تقاضا تھا کہ مرد کو وراثت میں زاید حصہ دیا جاتا۔ اور اگر اس حقیقت کو وسیع النظری سے جائزہ لیا جائے تو بات مزید واضح ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم کے معاشی نظام میں رزق کی فراہمی کی ذمہ داری بنیادی طور پر حکومت کے سر ہوتی ہے۔ اس نظام میں مرد اور عورت کسی کے بھی محتاج نہیں رہتے۔ دونوں کو اس نظام کے تابع اپنی اپنی صلاحیتوں کے استعمال کی مکمل آزادی ہوتی ہے۔ اور دونوں برابر کی سطح پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ قرآن کریم کے اصولوں کے مطابق وراثت کی تقسیم یوں ہوتی ہے کہ سب سے پہلے متوفی کا قرض ادا کیا جاتا ہے۔ اسکے بعد اگر اس کی کوئی وصیت ہو تو اس پر عمل کیا جاتا ہے۔ اور اس کے بعد قرآن کریم کے مقرر کردہ حصص تقسیم ہوتے ہیں۔ ان تینوں کے علاوہ جو صورتِ حال ہوگی اس میں حصص کی تقسیم اس اصول کے مطابق ہوگی۔ یعنی ایک مرد کو دو عورتوں کے برابر حصہ ملے گا۔

ہمارے علماء نے باقی تین اصولوں کی تو پرواہ نہیں کی لیکن اس آخری اور عمومی اصول کو بنیاد بنا کر عورت کا خوب استحصال کیا۔ یہی حال ان کا قانونِ شہادت کے سلسلہ میں ہے۔ یہاں پر عورت کو نہ صرف آدھا قرار دیا

نے یہ الزام بھی عائد کیا کہ اسے نسیان کا مرض لاحق ہوتا ہے۔ یعنی بھول جانا عورت کی فطرت ہے۔ فطرت کے متعلق تو ہم بعد میں عرض کریں گے پہلے یہ دیکھ لیجئے کہ شہادت کسے کہتے ہیں۔ شہادت جسے یہ قانون کا درجہ دیتے ہیں دراصل کسی بھی قانون کا بذاتِ خود ایک حصہ ہوتی ہے۔ قانون کا اطلاق تو عمومی ہوتا ہے لیکن کسی قانون کے ایک حصے کا اطلاق اسی قانون سے مختص ہوگا۔ قرآن کریم نے اپنے مختلف قوانین کے لئے شہادت کے جداگانہ طریقے بتلائے ہیں۔ مثلاً کسی عورت کی فحش حرکات کے ضمن میں کہا۔ فَاسْتَشْهِدُوا عَلَيْهِنَّ أَرْبَعَةً مِّنكُمْ ج..... (۴/۱۵) یہاں چار کی گواہی طلب کی لیکن مرد اور عورت کی کوئی تخصیص نہیں کی۔ اس طرح مردوں کی فحش حرکات کے ضمن میں کہا: وَالَّذَانِ يَأْتِيَانِهَا مِنكُمْ فَآذُوهُمَا ج..... (۴/۱۶) یہاں نہ مرد اور نہ عورت کی گواہی طلب کی بلکہ سیدھا کہا کہ انہیں مناسب سزا دو۔ بنا بریں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ شہادت کا جو طریقہ ایک قانون کے لئے ہوگا وہی طریقہ سب کے لئے اختیار کیا جائے گا۔ قرآن کریم کے جس قانون سے عورت کی آدھی گواہی ثابت کی جاتی ہے دستاویزات سے متعلق قانون ہے (۲/۲۸۲) اس میں قرض اور کاروبار کے سلسلے میں تحریر کی جانے والی دستاویزات کی جزئیات بتلائی گئی ہیں۔ اس قانون کی باقی جزئیات پر تو کوئی توجہ نہیں دی البتہ گواہی کے جزو کو بنیاد بنا کر ایک عورت کو آدھا ضرور کر دیا ہے۔ ہمارے علماء کو عورت سے جو خدا واسطے کا بیر ہے، یہاں ابھر کر سامنے آتا ہے۔ بہرحال ہماری فہم کے مطابق اوّل یہ کہ گواہی کا جو طریقۂ کار دستاویزات کے سلسلہ میں مذکور ہے اس کا اطلاق کسی دوسرے معاملے میں نہیں ہوسکتا۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا قرآن کریم کی رُو سے ہر معاملے کیلئے شہادت کا ایک مخصوص طریقۂ کار ہے۔ اس کے مطابق بعض شہادات میں عورت اور مرد کی کوئی تخصیص نہیں۔ بعض میں عورت اور مرد کی شہادت کو برابر کا وزن دیا گیا ہے اور جہاں شہادت کا سرے سے ذکر ہی نہیں وہاں قرآنی حکومت خود کوئی بھی طریقہ اختیار کرسکتی ہے۔ دوئم یہ کہ شہادت کا کوئی طریقہ کار بھی ہو۔ عورت کا بہرحال کوئی استحقاق مجروح نہیں ہوتا۔ قانونِ دستاویزات میں مرد کے برابر دو عورتوں کی شہادت کا جو ذکر ہے اس کی غرض و غائت بھی وہیں واضح کر دی۔ اور وہ یہ کہ:

أَن تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَىٰ

اگر ان دو میں سے ایک بھول جائے یا کوئی اشتباہ (CONFUSE) لاحق ہو جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے۔ بصورتِ دیگر گواہی صرف ایک عورت کی ہوگی۔

اس آیۂ کریمہ میں نسیان اور اشتباہ کا جو ذکر ہے اسے ہمارے علماء کرام عورت کی فطرت قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک فطرت چونکہ اٹل ہوتی ہے۔ لہٰذا عورت کے اس نقص کو ہر معاملے میں مدِنظر رکھنا چاہیئے۔ ہمارے نزدیک ان کا یہ خیال بھی درست نہیں۔ اس لئے کہ فطرت صرف جانوروں کی ہوتی ہے۔ صرف وہی ایک راستے پر چلنے کیلئے مجبور

ہیں۔ انسان کی فطرت نہیں بلکہ ایک نفسیات ہوتی ہے۔ اور اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ فطرت کی طرح اٹل نہیں بلکہ وقت، مقام، اور حالات کے مطابق لحہ بہ لحہ بدلتی رہتی ہے۔ جاہل سے عالم، کمزور سے طاقتور، غریب سے امیر، مجرم سے شریف اور ان کا عکس سب انسان کی تغیر پذیری کو ظاہر کرتے ہیں۔ قرآن کریم انسانی نفسیات کو بہت اہمیت دیتا ہے۔ لونڈیوں کے سلسلے میں کہا ان سے نکاح کرو، انہیں حقیر مت جانو اور باعزت ساتھی کا مقام دو اس لئے کہ ایمان کی رُو سے تم سب برابر ہو۔ لیکن نکاح کے بعد ان سے اگر کوئی فحش حرکت سرزد ہو جائے تو ان کی سزا آزاد مومن عورت کے مقابل آدھی ہوگی۔ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ط..... (۴/۲۵) اس آدھی سزا کی وجہ یہ تھی کہ ایک لونڈی جس ماحول میں پرورش پاتی ہے اس میں نفس کی نشوونما اس حد تک نہیں ہو پاتی کہ وہ زندگی کی اعلیٰ اقدار کی حفاظت کر سکے۔ ہمارا عام مشاہدہ ہے کہ مناسب تعلیم و تربیت نہ ہو تو نہ صرف عورت بلکہ مرد بھی صحیح طور سے اظہارِ بیان نہیں کر سکتے۔ کبھی اتفاق ہو تو کسی گنوار کو عدالت میں بیان دیتے وقت ملاحظہ فرمائیے۔ آپ پر دو عورتوں کی شہادت کی وجہ از خود واضح ہو جائے گی۔ عورت جس گھٹن، دباؤ اور جہالت میں زندگی بسر کرتی ہے۔ اس کی وجہ سے نسیان یا جذباتیت کا شکار ہو جائے تو وہ اس کی فطرت نہیں کہلائے گا۔ دورِ جاہلیہ میں عورت کی یہی کیفیت تھی اور سچ تو یہ ہے کہ آج کے مہذب دور میں بھی، بالخصوص ہم مسلمانوں کی عورتوں کی ایک اکثریت اسی طرح کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ جب بھی عورت نے اس کی راہنمائی میں سفر شروع کر دیا وہ نہایت فصیح البیان ہو جائے گی۔ اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً لا فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا لا عُرُبًا اَتْرَابًا لا..... (۵۶/۳۵-۳۶) اس میں جملہ صفات پیدا ہو جائیں گی، اور پھر مُلّا نہیں کہہ سکے گا کہ عورت کم عقل ہے، کمزور ہے، آدھی ہے۔

ان تصریحات کے بعد، اب ہم ستر و حجاب کے احکام کو لیں گے۔ اس ضمن میں کہا جاتا ہے کہ عورت کی زیب و زینت اور خوشنمائی جہاں ایک طرف مرد کی گمراہی کا سبب بن سکتی ہے تو دوسری طرف خود اس کی اپنی جان کے لئے بھی خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ لہٰذا ایک عورت کو گھر سے باہر قدم نہیں رکھنا چاہیئے اور اگر یہ ناممکن ہو تو پھر اسے اپنے آپ کو اچھی طرح ڈھانپ کر باہر آنا چاہیئے۔ ان دلائل و براہین کی تائید میں قرآن کریم کی جن آیات کا حوالہ دیا جاتا ہے، ان کے بغور مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ علماء کی یہاں پر بھی وہی ذہنیت کارفرما ہے جس کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں، یعنی عورت کو مرد کے مساوی نہ سمجھنا! ہمارے علماء معلوم ہوتا ہے کہ عورت کو بس پتھر کی ایک مورتی سمجھتے ہیں، جس میں نہ کوئی جذبہ ہوتا ہے، نہ خواہش اور نہ ہی کوئی احساس! یہ سب صفاتِ عالیہ صرف مردوں کیلئے مختص ہیں۔ اگر انہیں احساس ہو جاتا کہ جتنی دلکشی اور دلربائی مرد کے لئے عورت میں ہے اتنی ہی کشش عورت کے لئے مرد میں ہے، تو یہ کبھی نہ کہتے کہ عورتیں مردوں کو گمراہ کرتی ہیں۔ یہ الزام مردوں پر بھی عائد

سکتا ہے اور اس ضمن میں جو پابندیاں اور قیود عورتوں کے لئے ہیں ان کا اطلاق مردوں پر بھی ہوتا ہے۔ جذبات و
ت ہر انسان میں پائے جاتے ہیں اور ہر ایک نے انہیں قانون کے تابع رکھنا ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم کی یہی
ت ہیں۔

وہ جسمانی پابندیوں سے زیادہ ذہنی تربیت پر زور دیتا ہے۔ کیونکہ انسان کے جذبات و احساسات پر کنٹرول
ح ممکن ہے انسان کوئی جانور نہیں کہ جسے کھونٹے سے باندھ کر سمجھ لیا کہ کھیت محفوظ ہو گیا۔ اسے
ے کے کھیت میں نہ گھسنے کیلئے تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم کی جن آیات سے یہ حضرات
ے کے احکام مستنبط کرتے ہیں ان کی اصل غرض و غائت بھی یہی تھی۔ لیکن چونکہ تربیت دینا تو ان حضرات
ے کی بات نہیں البتہ ان آیات کی رُو سے جتنا ممکن ہو سکتا تھا انہوں نے خوب کھونٹے گاڑے ہیں
ستم یہ کہ سب عورت کے لئے! تعمیرِ انسانیت کے لئے انسان کی جد و جہد کے راستے ہیں جو رکاوٹیں ہوتی
قرآنِ کریم ان کی نشاندہی کرتا ہے اور ان کا حل بتاتا ہے۔ اس حل کو خود ایک رکاوٹ قطعی نہیں بننا چاہیئے۔
نسانیت کے لئے قرآنِ کریم عورت سے بھرپور کردار کی توقع کرتا ہے۔ کیونکہ اس کی نگاہ میں مرد اور
ت دونوں کامل ہستیاں ہیں۔ دونوں نے اپنی ذات کی نشوونما بھی کرنی ہے۔ اور ساتھ کے ساتھ معاشرتی
ر اور نشوونما کا موجب بھی بننا ہے۔ اس ضمن میں بالخصوص عورت کی راہ میں جو مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں
کا حل تجویز کرتے ہوئے فرمایا:-

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ
مِنْ جَلَابِيبِهِنَّ ط

اے نبی! تو اپنے اہلِ خانہ اور دیگر مومن عورتوں سے کہہ دے کہ وہ باہر نکلیں تو اپنے کپڑوں کے
اوپر ایسا کشادہ سا کپڑا (جلباب) پہن لیا کریں۔ جس سے زینت نمایاں نہ ہو۔

لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ عورتیں صرف مردوں کی تسکین کا ذریعہ ہیں اور ان کا باہر آنا مردوں کو صرف لبھانا
ہوتا ہے، انہیں معلوم ہو جائے کہ ہر معاشرے کی عورت ایسی نہیں ہوتی۔ قرآنی معاشرے کی عورت جب باہر
قدم رکھتی ہے تو اس کے پیشِ نظر ایک نہائت بلند مقصد ہوتا ہے اس کے لئے ضروری تھا کہ قرآنی معاشرے
کی عورت کی شرافت کی ایک ظاہری پہچان ہو۔ لہٰذا جلباب اوڑھنے کے حکم کے متعلق فرمایا:-

ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَنْ يُعْرَفْنَ

تمہاری شرافت کی پہچان کیلئے (ظاہری طور پر) یہ بہترین ذریعہ ثابت ہوگا۔

ر اس کا فائدہ یہ بتایا کہ:-

فَلَا يُؤْذَيْنَ

اور اس کے بعد کوئی بدقماش تمہیں تنگ نہیں کر سکے گا اور کریگا تو اپنے کئے کی سخت سزا پائیگا۔

وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۳۳/۵۹)

یاد رکھو! خدا کا قانونِ حفاظت (غفور) اور نشوونما (رحیم) کے سارے سامان اپنے اندر رکھتا ہے۔

قرآنِ کریم کے اس حکم کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ عورت مرد کی بربریت اور وحشت سے یوں محفوظ ہو کر کاروبارِ زندگی میں بھرپور کردار ادا کر سکے۔ لیکن ہمارے علماء نے اس حکم کو بجائے خود عورت کی ترقی کی راہ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ بنا دیا۔ برقع کا جو تصور انہوں نے دیا ہے اسے پہن کر تو زندگی کا کوئی کام بھی خوش اسلوبی سے سرانجام نہیں دیا جا سکتا۔ بہرحال یہ تھی وہ آیہ کریمہ جس کی بنیاد پر ستر و حجاب کی پوری عمارت تعمیر کر رکھی ہے۔ ان کے علاوہ جن دیگر آیات کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ان کا تعلق پردے کے احکام سے زیادہ عام آداب معاشرت سے ہے۔ مثلاً سورۃ احزاب کی آیت (۵۳) میں جہاں دیگر معاشرتی آداب کا ذکر کیا وہاں یہ بھی کہا۔ وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَسْئَلُوهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اور اگر تمہیں نبی کے گھر سے کوئی چیز لینی ہو تو اس کے لئے بھی یونہی بے محابا اندر نہ چلے جایا کرو۔ قاعدے کے مطابق پردے کے باہر سے اسے مانگا کرو۔ اسی طرح جب یہ کہا کہ۔ وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ۔ تو اس کا مفہوم یہ نہیں کہ تم گھروں میں بند ہو جاؤ "قَرْنَ" کا معنی ہے "سنجیدگی اور وقار" اور اس حکم کا مفہوم ہے کہ "تم نہایت سنجیدگی اور وقار سے اپنے گھروں میں رہو" (۳۳/۳۵)۔ یہ ایسے امور ہیں جن کا اہتمام انگریز بھی کرتے ہیں جو پردے کے سرے سے قائل ہی نہیں۔ ان کے دروازوں پر بھی لکھا ہوتا ہے۔ داخل ہونے سے پہلے دروازہ کھٹکھٹائیے (KNOCK AT THE DOOR)۔ اور ان کے گھروں کے اندر بھی جملہ آداب کو ملحوظِ خاطر رکھا جاتا ہے۔

عزیزانِ گرامی! آپ نے دیکھ لیا کہ قرآنِ کریم کی رُو سے عورت کی کیا پوزیشن ہے؟ تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ عورت آدھی نہیں بلکہ ایک مکمل انسان ہے۔ اس کی شخصیت میں ہر وہ صلاحیت موجود ہے جو کسی بھی انسان میں ہو سکتی ہے۔ ہم نے تو قرآنِ کریم کی صرف ان تعلیمات کا جائزہ لیا ہے جن کی آڑ میں عورت کے تشخص کو مسخ کیا جاتا ہے۔

اگر قرآنِ کریم کی منجملہ تعلیمات کو سامنے رکھ کر عورت اور مرد کا موازنہ کیا جائے تو عورت کی ہستی کئی گنا دُہری ملے گی۔ عورت کو وہ تمام حقوق حاصل ہیں جو کسی مرد کو حاصل ہو سکتے ہیں۔ مثلاً عزتِ نفس کا حق (۱۷/۷۰)، حقِ آزادی (۳/۷۹) جوہرِ ذاتی کے تحفظ کا حق (۴/۱۹) جنسی مساوات کا حق۔ (۴/۱) اکتساب رزق کا حق (۴/۳۲)۔ جان، مال اور عصمت کی حفاظت کا حق (۱۷/۳۳، ۴/۲۹، ۳۳/۶۰) شادی میں انتخاب کا حق (۴/۱۹)، حسن ذوق کا حق۔ (۷/۳۲) اور

سب سے بڑھ کر یہ کہ اکتسابِ رزق کئے بغیر استحقاقِ رزق! یہ حق مردوں کو حاصل نہیں۔ الرجال قوامون علی النساء۔ کیونکہ کنبہ کی کفالت کی بنیادی ذمہ داری مرد کی ہے۔ اس ضمن میں مرد جو کچھ خرچ کرے گا۔ قانون کے احترام میں شمار ہوگا۔ یہ مرد کی عنایت یا ترحم خسروانہ کا معاملہ نہیں ہوگا۔

عورت کے خلاف ہماری مذہبی پیشوائیت کا جو رویہ ہے اس کی وجہ قرآنِ کریم کی تعلیمات نہیں بلکہ اس طبقہ کی مخصوص نفسیات ہے۔ اس لحاظ سے ہندو، سکھ، عیسائی یا دنیا کا کوئی اور مذہب، سبھی برابر ہیں۔ دیگر مذاہب میں بھی عورت کی جو حالتِ زار ہے اس کا ذمہ دار یہی طبقہ ہے۔ مذہبی پیشوائیت کی نفسیات عام افراد سے مختلف ہے۔ جس ماحول میں ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت ہوتی ہے وہ شروع ہی سے ہٹ دھرمی، تنگ نظری اور مفاد پرستی پر مبنی ہوتا ہے۔ قدم قدم پر فتوے صادر کرنا ان کا شیوہ ہوتا ہے۔ زندگی کی ہر خوش نما اور زیب و زینت والی چیز اپنے اوپر حرام قرار دے رکھی ہوتی ہے۔ عورت سے ان کی نفرت اور بیزاری محتاجِ بیان نہیں۔ ان کے ایمان کی کمزوری کا بنیادی سبب عورت ہوتی ہے۔ اسے یہ پست ترین مخلوق کا درجہ دیتے ہیں۔ اب آپ خود اندازہ کر لیجئے کہ ایک عورت، جس کی کوکھ سے بچہ جنم لیتا ہے، جس کی گود میں پرورش پاتا ہے، جس کا وہ لختِ جگر ہوتا ہے، اور جو بچے کی زندگی کا انتہائی قیمتی سرمایہ ہوتی ہے۔ جس کی ممتا اس کے ننھے منے معصوم ذہن پر اپنے ابدی نقوش مرتب کرتی ہے۔ اسے حقیر اور پست سمجھا جائے، قدم قدم پر ذلیل و خوار کیا جائے، بات بات پر ڈانٹ کھانا، طعنے سننا اس کا مقدر ہو، نگاہ نیچی، آواز دبی دبی، جسم لپٹا۔ غرضیکہ ہر پابندی اس پر کرفیو کی طرح نافذ ہو۔ وہ کیسی نفسیات کے حامل افراد کو جنم دے گی؟

قرآنِ کریم ایک وسیع المعانی اور آفاقی کتاب ہے۔ یہ نوعِ انسان کیلئے آخری راہنمائی ہے۔ اللہ تعالےٰ نے اس کے اصول و قوانین ایسے سلیقے سے مرتب کئے ہیں کہ فکرِ انسان جوں جوں ترقی کرے اسے اپنی نشوونما کے لئے راہنمائی بدستور ملتی رہے۔ یہ صرف اسی کتابِ عظیم کا خاصہ ہے! اللہ تعالےٰ کی منشاء تھی کہ انسان نے اس کتاب کی راہنمائی میں اپنی عقل کو اگر تھوڑا سا بھی استعمال کیا تو یہ زندگی کے ہر موڑ پر اپنی منزل کا صحیح تعین کرے گا۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ تعلیم و تربیت کا ایسا نظام تشکیل دیا جاتا جس میں اس کتاب کے اصول و قوانین ہر علم کی بنیاد ہوتے۔ اس طرح انسان کے قلب و نظر میں بے پناہ وسعت اور کشاد پیدا ہوتی۔ قرآنِ کریم کو سمجھنے کے لئے جتنی وسعتِ نظر اور کشادِ قلب درکار ہوتی ہے، وہ ہماری مذہبی پیشوائیت کو حاصل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ حضرات قرآنِ کریم کے اصول و قوانین کے نہایت ہی محدود مفہوم اخذ کرتے ہیں۔ یہ صلاحیت اگر ان میں ہوتی تو عورت کے خلاف ایک بات نہ کہتے یا کم از کم مرد کو اس کا حاکم کبھی قرار نہ دیتے۔ ان کی اس تعلیم و تبلیغ کے معاشرے کی مجموعی نفسیات پر نہایت بھیانک اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ آج معاشرے میں ہر کوئی "اکڑ خان" بنا

پھرتا ہے۔ اور عورت کی طرح جو بھی ہے کچلا جا رہا ہے۔ قرآن کریم نے مردوں کو عورتوں کا محافظ اور کفیل بنایا تھا۔ اگر یہ تصور عام ہو جاتا تو آج ایک اسلامی معاشرے میں سب سے محفوظ ترین اور باعزت شخصیت عورت کی ہوتی۔ عورت مرد سے زیادہ بے باک اور نڈر ہوتی۔ غور کیجئے! جس بہن کے ایک نہیں لاکھوں بھائی محافظ و نگران ہوں اسے کاہے کا اندیشہ! کوئی غلط نگاہ اس کی طرف نہ اٹھتی! کوئی شریر ہاتھ اس کی طرف نہ بڑھتا! آزادی کی نہائت اعلیٰ سطح پر زندگی بسر کرتی، اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول مبارک کا جیتا جاگتا ثبوت ہوتی۔ کہ "میرے قائم کردہ معاشرے میں ایک عورت شام سے لیکر یمن تک، زیورات میں لدی پھندی سفر کرے گی لیکن اسے کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوگا"۔ ہمارے مذہبی پیشوا اپنے آپ کو جانشینِ رسول کہتے ہیں، اور حالت ان کی یہ ہے کہ عورت کے قدم کی ہر چاپ پر ان کا ایمان ضائع ہو جاتا ہے۔

عزیزانِ گرامی! مذہبی پیشوائیت کا تو کوئی علاج نہیں۔ اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے کہ شکر کرو ان کے ہاتھ میں اقتدار نہیں۔ اَمْ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّنَ الْمُلْكِ۔ اگر اقتدار بھی ان کے ہاتھ آجائے۔ فَاِذًا لَّا يُؤْتُوْنَ النَّاسَ نَقِيْرًا (۴/۵۳) تو یہ لوگوں کا جینا دوبھر کر دیں۔ جو تھوڑی بہت چھوٹ دے رکھی ہے، اسے بھی چھین لیں! اللہ تعالےٰ نے انہیں قیامت تک کے لئے مہلت دے رکھی ہے۔ یہ ہر سمت سے آپ پر حملہ آور ہوں گے۔ ان سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ آپ ہمیشہ قوانینِ خداوندی کو مدِ نظر رکھیں (تمسک بالکتاب)۔ عورت کے حقوق، مرتبے اور مقام کے بارے میں انہوں نے بہت غلط فہمیاں پھیلا رکھی ہیں۔ میں نے ان میں سے صرف چند ایک کا ذکر کیا ہے۔ اور کوشش کی ہے کہ بات قرآنِ کریم کی رُو سے واضح ہو جائے۔ آخر میں صرف اتنی گزارش کروں گا کہ یاد رکھیئے! جب تک عورت کو گھر میں اور معاشرے میں باعزت مقام حاصل نہیں ہوتا معاشرے کی پستیاں اور خرابیاں کبھی دُور نہیں ہو سکتیں۔ اس لئے کہ جاہل کمزور، نااہل اور احساسِ کمتری کی شکار عورت کبھی بھی آزاد اور ذمہ دار شہری پیدا نہیں کر سکتی۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہم میں احترامِ آدمیت، عزتِ نفس، آزادیٔ اظہارِ رائے، تعاون اور بقائے باہمی جیسی اعلیٰ صفات پیدا ہوں تو اس کے لئے عورت کے کردار کی اہمیت کو تسلیم کرنا پڑے گا۔

وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فکرِ پرویزؒ اور ہمارے دانشور

.... محمد عمر دراز

علّامہ غلام احمد پرویزؒ نے قرآن فہمی کے سلسلہ میں، حضرت علّامہ محمد اقبالؒ سے کسبِ ضیاء کرتے ہوئے جو نئی طرح ڈالی تھی، (بحوالہ پیش لفظ لغات القرآن۔ جلد اول ایڈیشن دوم ء صفحہ نمبر۱۹) اُس سے ہزاروں نہیں لاکھوں، مذہب سے برگشتہ نوجوان، جو قلبِ سلیم رکھتے تھے(**اِلّا من اتی اللہ بقلب سلیم** ۲۶/۸۹) لیکن ہمارے کرم (فرمایانِ) دین، علمائے کرام کی خود ساختہ اور مفاد پرستانہ تشریح و تعبیرِ قرآن و اسلام کی بِنا پر نفسِ اسلام ہی سے متنفّر ہو چکے تھے، بارگاہِ قرانی میں کشاں کشاں آئے اور اپنے قلوب واذہان کو پرویزؒ صاحب کی قرآنی فکر کی روشنی میں، نُورِ قرآن سے منوّر کرتے ہوئے، خالقِ کائنات کی طرف سے اِنسانوں کی ابدی ہدایت و رہنمائی کے لئے اس آخری کتاب کی عظمتوں سے رُوشناس ہوئے۔

ہمارے ہاں عام طور پر اسلام کو ایک مذہب سمجھا اور جانا جاتا ہے، جو اس بے مثل و بے نظیر نظامِ حیات کے ساتھ صریحاً ظلم ہے۔ علّامہ پرویزؒ نے با آہنگِ بلند اُمّتِ مسلمہ اور ساری دنیا کو یہ بتایا کہ اسلام مذہب نہیں، دین ہے۔ مذہب خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلّق کا نام ہے جس کی نوعیت ہر شخص کے اپنے عقائد و خیالات کے مطابق ہوتی ہے۔ جب کہ یہ دین(**ان الدین عند اللہ الاسلام** ...۱۹ر۳) ایک ایسا مکمّل نظامِ حیات پیش کرتا ہے جو انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کے ہر گوشہ کو محیط ہے۔ آج پاکستان میں آپ کو مذہبِ اسلام کی جگہ دینِ اسلام، دینِ اسلام کی جو پکار ہر طرف سنائی دیتی ہے، اُس کی آبیاری میں اس عظیم مفکّر کا خونِ جگر بھی شامل ہے۔

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض بزعمِ خویش اصحابِ علم پرویزؒ صاحبؒ کی فکری کاوشوں کا مطالعہ کئے بغیر، مذہب پرست طبقہ کے پراپیگنڈا سے متاثر ہو کر، ان پر مختلف قسم کے فتاویٰ صادر کرتے رہتے ہیں۔ ان میں اہلِ مذہب بھی ہیں اور اہلِ ادب بھی۔

حال ہی میں مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد کی طرف سے ایک کتاب شائع ہوئی ہے، جس کا نام ہے "اُردو ادب کی مختصر تاریخ" (گو یہ کتاب ۲۲۷ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے) اور جو ڈاکٹر انور سدید صاحب کی

تحقیق کا نتیجہ ہے۔ ہمیں یہ تو معلوم نہیں کہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے کس حد تک پرویزؒ صاحب کا مطالعہ کیا ہے اور اپنی تحقیق میں وہ کس قدر دیانت دار ہیں' لیکن اُنہوں نے اس کتاب میں "دینی ادب" کے باب میں علّامہ پرویزؒ کے متعلّق جو کچھ لکھا ہے' اس سے اُن کے مبلغ علم کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اپنی کتاب کے اس باب سے (غالباً) علّامہ پرویزؒ کو نظر انداز تو نہ کر سکے لیکن اپنی کم علمی کا انہوں نے بھرپور ثبوت دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :-

"غلام احمد پرویز (متوفی ۱۹۸۵ء) کا طلوع' انگریزی حکومت کے ملازم پیشہ طبقے سے ہوا تھا۔ انہوں نے ایمان اور عمل کے موضوع پر رسالہ معارف' اور ترجمان القرآن' میں مضامین سے ابتداء کی اور پھر اپنا رسالہ طلوع اسلام جاری کیا۔ دینِ اسلام کی تعبیر و تشریح میں انہوں نے آزاد خیالی اور مغرب پسندی سے کام لیا ہے۔ انہوں نے مذہب اور دین میں بھی مابہ الامتیاز قائم کیا (کتاب میں ایسے ہی لکھا ہے)۔ مغربی تصوّرات کی روشنی میں اسباب زوالِ اُمّت کی توضیع کی اور تعمیرِ نو کے لئے قومی ملکیت کو ضروری قرار دیا۔ غلام احمد پرویز نے فکری زاویوں کو اسوۂ رسول سے راہنمائی حاصل نہیں کی تھی' (کتاب میں اسی طرح لکھا ہے) اس لئے ان کے خلاف ردِّ عمل بھی پیدا ہؤا اور ان کے اثر و عمل کا دائرہ محدود ہو گیا۔" (اُردو ادب کی مختصر تاریخ' ایڈیشن ۱۹۹۱ء۔ صفحہ نمبر ۶۸۴)

ہم اس پر کچھ تبصرہ کرنے کے بجائے' ڈاکٹر انور سدید صاحب کی Education' کے لئے' علّامہ غلام احمد پرویزؒ کی' سیرتِ نبویؐ پر عظیم تصنیف 'معراجِ انسانیت' سے اس باب کو نقل کئے دیئے ہیں' جو انہوں نے فخرِ موجودات' سرورِ کونین' حضور نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہورِ قدسی پر تحریر کیا ہے اور جس کا انہوں نے عنوان ہی "صبحِ بہار" باندھا ہے اور ڈاکٹر انور سدید صاحب سے یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا یہ تحریر پڑھنے کے بعد بھی (جو اُنہوں نے یقیناً اس سے پیشتر نہیں پڑھی ہو گی) وہ یہی سمجھتے ہیں کہ علّامہ پرویزؒ کے فکری زاویوں نے اسوۂ رسولؐ سے راہنمائی حاصل نہیں کی؟۔

کیا وہ شخص' جس کے ایک ایسے مضمون میں' جو بالواسطہ نفسِ موضوع سے متعلّق بھی نہیں' مقامِ نبوت کی وضاحت پڑھ کر' ایک جج یہ فیصلہ دے دیتا ہے کہ قادیانی عقائد اختیار کرنے والا شخص دائرہ اسلام

ـت خارج ہو جاتا ہے (مقدمہ مرزائیہ بہاولپور ۱۹۲۶ء تا ۱۹۳۵ء) مغربی تصوّرات کی مصنوعی روشنی سے کام ـتا ہے یا اس کے راستے اُس نورِ ازل سے منوّر ہیں جسے نازل کرنے والے نے نورِ مُبین (نوراً مبینا"۔ ـ ار ۴) کہہ کر پکارا ہے اور جو سرکار دو عالم کے ظہورِ قدسی کے متعلّق یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ:۔

"یہ تھا حاصلِ بہارِ چمنِ کائنات کہ جس کا ظہور صبحِ بہارِ کائنات تھا"۔

کیا ایسے شخص کے متعلّق یہ گمان بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے فکری زاویوں نے اسوۂ رسولؐ سے راہنمائی حاصل نہیں کی، جو ساری دنیا سے کہتا ہو کہ حضورؐ کے بعد:۔

"انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے کسی دوسری مشعلِ راہ اور کسی اور ہادیٔ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقامِ بلند تک پہنچنے کے لئے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اُس ذاتِ اقدسؐ و اعظم کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ ور پکار اُٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق دِل بند و راہِ مصطفےٰ رو"

(معراجِ انسانیت باب صبحِ بہار)

نوجوانوں کے لیئے فکر و نظر کی نئی راہیں

سلیم کے نام

از پرویزؒ

کیا اس شخص کے متعلّق دیانت داری سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی فکر کا راہنما' اُس سراجِ منیرؐ (سراجاً منیراً" - ۴۶/۳۳) کے نقوشِ پا کے علاوہ کچھ اور ہو سکتا ہے؟

علّامہ غلام احمد پرویزؒ کے دل میں حضور ختمی مرتبت کا احترام اور آپؐ سے اُن کی مبنی بر دلائل و براہین عقیدت کا یہ حال تھا کہ انہوں نے آپؐ کی سیرتِ مطہرہ پر اپنی مذکورہ کتاب (معراجِ انسانیت) کا بابِ اوّل 'فاتحۃ الکتاب' لکھتے وقت آپؐ کے مقامِ ارفع و اعلیٰ اور اپنی کم مائیگی کے احساس کو ان الفاظ میں قلمبند کیا ہے۔

فاتحۃ الکتب

----(طبع اول)----

آنچہ من در بزمِ شوق آوردہ ام دانی کہ چیست
یک چمن گل' یک نیستاں نالہ' یک خم خانہ مے

معارف القرآن جلد سوم کے عنوان "تلک الرسل" کا آغاز اِن الفاظ سے ہوا تھا:-

طائرانِ حظیرۂ قدس کا وہ کاروانِ شوق جو صبحِ ازل جھلملاتے تاروں کی سکون افزا شبنمی چھاؤں میں' جانبِ منزل روانہ ہوا تھا' قندیلِ آسمانی کی بصیرت افروز و جہاں تاب روشنی میں زمزمہ سنج و نغمہ بار' جذب و کیف کی نورانی وادیاں طے کرتا' اُس مقام تک آ پہنچا ہے جہاں سے چراغِ منزل' روشنی کے جگمگاتے مینار کی طرح' دُور سے مسکراتا نظر آ رہا ہے۔ وہ مقام جہاں اس منزل کی تکمیل ہو گی جس کے لئے خاک کے ذرّے' مختلف ارتقائی ادوار طے کر کے پیکرِ آدم میں متشکّل ہوئے اور یہ پیکرِ آب و گِل' مقامِ شرف و مجدِ انسانیت کی طرف رواں دواں جادہ پیماہ ہوُا۔ یہ راحلۂ شوق اس وقت میقات میں پہنچ چکا ہے۔ وہ دیکھئے ہر فردِ کارواں مصروفِ احرام بندی ہے کہ اب اگلا قدم حریمِ کعبہ ہو گا۔ جب تک یہ کارواں تیاریوں میں مصروف ہے' آیئے ہم ان قطع کردہ راہوں پر ایک طائرانہ نگہِ باز گشت ڈالیں تاکہ گزری ہوئی منازل کی یاد پھر سے تازہ ہو جائے اور ہم ان شگفتہ و شاداب پھولوں کو دامنِ نگاہ میں لئے' اِن کے ساتھ آگے بڑھیں کہ اس سے آگے فاران کی مقدّس وادی میں پہنچ کر' جہاں کا ہر سنگ ریزہ' جلوہ فروشِ صد طُور اور ہر ذرّہ' آئینہ نمائے ہزار سینا ہے' اس کی فرصت نہ مل سکے گی' اس لئے کہ وہاں قلب کی ہر حرکت صرفِ

اور نگاہ کی ہر جنبش وقفِ سجود ہو گی۔
میقات پر پہنچ کر ہر زائرِ حریمِ قدس کا ولولۂ شوق تیز اور راحلۂ ذوق عناں گسیختہ ہو جاتا ہے کہ منزل کا ب اور عیدِ نظارہ کی کشش اس کے رگ و پے میں بجلیاں بھر دیتی ہے۔ لیکن اس مقام پر میرا یہ عالم ہے کہ ذوق و شوق کی تمام برق آسا بے قراریاں اور جذب و کیف کی والہانہ سرمستیاں یکسر حیرت بن گئیں ۔ یہ وہ مقام ہے جہاں کا ہر ذرہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ:۔

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و با یزید ایں جا!

معارف القرآن کی پہلی جلدیں اس منزل تک پہنچنے کی تمہید تھیں لیکن یہاں پہنچ کر اس سدرۃ المنتہٰی کی بلندی اور اپنے دستِ شوق کی کوتاہی مشہوداً سامنے آگئی جس سے کیفیت یہ ہو ئی کہ جب بھی قلم اُٹھانے کا ارادہ کیا:

چشم بروئے او کشا، باز بخویشتن نگر!

کا احساس فوراً عناں گیر ہو گیا۔ لیکن اس مقام پر بھی اُسی توفیقِ ایزدی اور رفاقتِ خداوندی نے میری دستگیری فرمائی جس نے بایں شکستہ بالی و ناتوانی مجھے یہاں تک پہنچنے کی ہمّت عطا فرمائی تھی۔ **فالحمد اللہ علی ذلک نعم المولی و نعم الوکیل۔**

آسمانی سلسلۂ رُشد و ہدایت سے مقصود و مطلوب کیا ہے؟ اس کی تشریح و تبیین میں کتابوں پر کتابیں لکھی جا سکتی ہیں، لیکن اگر اسے مُجملاً چند الفاظ میں سمجھنا ہو تو اس سے مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنی تمدنی اور معاشی زندگی، یعنی ہیئتِ اجتماعیہ کو کس طرح اُن مستقل اقدار سے ہم آہنگ رکھ سکتا ہے جو ایک ہمہ گیر آفاقی ضابطۂ قوانین کی حیثیت سے، کارگہِ ہستی کو اس نظم و ضبط، توازن و اعتدال اور حسن و رعنائی سے نہ صرف سرگرمِ عمل رکھ رہی ہیں بلکہ اُس کے تعمیری پہلوؤں کو بروئے کار لا کر، اسے تخلیقی ارتقاء کے مراحل طے کراتے ہوئے رواں دواں جانبِ منزل لئے جا رہی ہیں۔ قرآنِ کریم میں اقوام و ملل سابقہ کے احوال و کوائف اور حضرات انبیاء کرام کے تذکارِ جلیلہ سے بھی یہی بتانا مقصود ہے کہ جب انسان نے اپنی تمدنی اور معاشی نظام (یعنی حیاتِ اجتماعیہ) کو قوانینِ خداوندی سے الگ کر لیا تو اس کا نتیجہ زندگی کی

اُن ناہمواریوں کی شکل میں سامنے آگیا جسے وہ فساد کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے اور جس سے کاروانِ انسانی، شرف و مزیّت کی طرف جانے کی بجائے سبعیت و بہیمیت کی پستیوں کے جہنّم میں جاگرا اور اس کے برعکس، جب اُنہوں نے اپنی زمینی زندگی" (حیاتِ ارضی۔ معاشی نظام) اور آسمانی اقدار میں توافق اور ہم آہنگی پیدا کرلی (جسے تقویٰ کہا جاتا ہے) تو کس طرح زمین اپنے نشو و نما دینے والے کے نُور سے جگمگا اُٹھی اور عالمِ انفس و آفاق میں کس طرح شگفتگی و شادابی کی جنّتیں کِھل کِھلا کر ہنس پڑیں۔ بعثتِ نبیٔ اکرم کے وقت یہ فساد اپنی وسعتوں اور گہرائیوں کے اعتبار سے پوری شدّت اختیار کرچکا تھا لیکن نوعِ انسانی کے اس محسنِ اعظمؐ اور آسمانی انقلاب کے اس داعیٔ اکبرؐ کے تئیس سالہ سعیٔ و عمل سے انسانی نظامِ حیات کے یہ تمام ناہموار گوشے یکسر ہمواریوں اور استواریوں میں بدل گئے اور انسانیت نے اُس فردوسِ گم گشتہ کو اپنی آنکھوں کے سامنے تبسّم ریز و کوثر فشاں دیکھ لیا جس کی تلاش میں وہ قرن ہا قرن سے حیران و سرگرداں پھر رہی تھی۔ لہٰذا سیرت محمدیہ در حقیقت تعارف و تاریخ ہے اُس انقلاب کی جس سے انسانیت اور ناہمواریوں کے اُن ذلّت آمیز و کرب انگیز جہنم سے نکال کر جنہیں اُسے ملوکیت کی ستمگرانہ دست درازیوں پستیوں اور پیشوائیت کی ابلیسانہ دسیسہ کاریوں اور مفاد پرست گروہوں کی سفاکانہ خون آشامیوں نے دھکیل رکھا تھا، بلندیوں اور ہمواریوں کی اُس رُوح پرور و نشاط انگیز جنّت میں جا پہنچی جس میں ہر متنفّس کے مضمر جوہروں کی بالیدگی اور ثمرباری کے اسباب و مواقع بلا روک ٹوک موجود تھے۔ **کشجرہ طیبہ اصلھا ثابت وفرعھا فی السماء لا** ۲۴/۱۴) اُس شجرِ طیّب کی طرح جس کی جڑیں زمین (کے معاشی اور تمدنی نظام) میں محکم و استوار ہوں اور جس کی شاخیں آسمانی (اقدارِ مستقلہ کی) جنّت در آغوش فضاؤں میں مسرّتوں کے جھولے جھول رہی ہوں۔ **ذلک ھو الفوز العظیم**" اب آپ علّامہ غلام احمد پرویزؒ کی تحریر کا حسن اور ذاتِ رسالت مآب **علیہ التحیہ والسلام** سے اُن کی عقیدت و احترام کی جھلک خود لاحظہ فرمائیں:۔

صبحِ بہار

اے ظہور تو شبابِ زندگی
جلوہ ات تعبیرِ خوابِ زندگی

جب زمین گرمی کی شدّت سے تمتما اُٹھتی ہے، تمازتِ آفتاب اس کی رگ رگ سے نمِ زندگی چُوس لیتی ہے، آسمان کی شعلہ ریزیاں ساری فضا کو دہکتا ہوُا انگارہ بنا دیتی ہیں، بادِ سموم کی ہلاکت سامانیاں تازگی و

شگفتگی کی ہر نمود کو جُھلس ڈالتی ہیں' پھول مرجھا جاتے ہیں' شگوفوں کی گردن کے منکے ٹوٹ جاتے ہیں' لالہ کا رنگ اُڑ جاتا ہے' پتّیاں سوکھ جاتی ہیں' شاخیں پثر مُردہ ہو جاتی ہیں' لہلہاتی کھیتیاں خشک ہو جاتی ہیں' سرو و صنوبر آتشدانِ ارضی کے دُود کش دکھائی دیتے ہیں' تابندہ چشمے دیدۂ کور کی طرح بے نُور ہو جاتے ہیں' مرمریں ندیاں خطِّ تقدیرِ محکوماں کی طرح بے آب رہ جاتی ہیں' لُوکی دہشت سے سائے کانپتے ہیں' راستے ہانپتے ہیں' خُنکی غاروں میں منہ چھپا لیتی ہے' ٹھنڈک سہم کر کنوؤں میں جا دبکتی ہے اور تپش سے سینۂ کائنات میں سانس رُکنے لگتی ہے۔ جنگل کے جانور آسمانی شعلوں کی لپیٹ سے کہیں پناہ نہیں پاتے۔ پرندے اپنے گھونسلوں میں نرم و نازک زبانیں نکالیں نڈھال ہو کر پڑ جاتے ہیں۔ طائرِ نگاہ تک بھی کاشانۂ چشم میں سمٹ کر رہ جاتا ہے۔ انسان' زندگی اور اُس کی تمام لطافتوں سے مایوس ہو جاتا ہے۔ سوختہ بخت کسان کھیت کے کنارے کھڑا للچائی ہوئی نظروں سے آسمان کی طرف تکتا ہے کہ کہیں سے اُس کی آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان دکھائی دے' لیکن اس کی خاسر و نامراد نگاہیں' حیرت بن کر اس کے ویرانۂ قلب میں لوٹ آتی ہیں۔ اس طرح جب حیاتِ ارضی کے کسی گوشے میں بھی اُمید کی نمی باقی نہیں رہتی۔ اور بساطِ کائنات کے کسی کونے میں بھی زندگی کی کوئی تازگی دکھائی نہیں دیتی تو یاس و نااُمیدی کے اس اِنتہائی عالم میں مبداءِ فیض کی کرم گُستری سے سحابِ رحمت کسان کی آنکھوں کا نُور بن کر فضائے آسمانی پر چھا جاتا ہے اور اپنی جواہر پاشیوں اور گہر ریزیوں سے دہنِ ارض کو بھرپُور کر دیتا ہے' زمینِ مُردہ میں پھر سے زندگی آ جاتی ہے۔ رگِ کائنات میں نبضِ حیات پھر سے متوّج ہو جاتی ہے۔ فضا کے سینے میں رُکی ہوئی سانس پھر سے زندگی کی جوئے رواں بن جاتی ہے' چشموں کی خشک آنکھیں شرابِ زندگی کے چھلکتے ہوئے جامِ نُور بن جاتی ہیں۔ ندّیوں کی بے آب لکیریں بادۂ جاں فزا کی مسیحا نفسی سے رگِ جاں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ سہمی ہوئی خنکیاں غاروں سے نکل کر فضاؤں پر چھا جاتی ہیں۔ دبکی ہوئی برودتیں' کنوؤں کی تہوں سے اُچھل کر بساطِ ارض پر پھیل جاتی ہیں۔ خشک پتّیوں میں جان پڑ جاتی ہے۔ مُرجھائے ہوئے پھلوں میں از سرِ نو تازگی و شگفتگی آ جاتی ہے۔ شگوفے چٹکتے ہیں' کلیاں مہکتی ہیں' ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کے نفیس و لطیف جھونکے سر سبز و شاداب درختوں کی شاخوں میں لچک اور پھلوں میں یوں جنبش پیدا کر دیتے ہیں گویا۔۔۔۔۔ بہار جھُول رہی ہے خوشی کے جھُولوں میں ۔۔۔۔۔ ہر طرف ایک نئی زندگی' اور ہر سمت ایک حیاتِ تازہ' جھومتی مسکراتی' مچلتی' لوٹتی' ایک ایسی جنّتِ نگاہ بن جاتی ہے' جس کی ہر دوش میں

مُسرّتوں کے چشمے اُبلتے اور ہر تختے میں قہقہوں کے پھول کھلتے دکھائی دیتے ہیں۔

وھو الذی ینزل الغیث من بعد ما قنطوا وینشر رحمتہ (۴۲/۲۸)

اور یہ اللہ ہی کی ذات ہے جو ایسی نا اُمیدیوں کے بعد اپنے سحابِ کرم کو بھیجتی اور اس طرح اپنی بساطِ رحمت کو صفحۂ ارض پر بچھا دیتی ہے۔

وھو الذی یرسل الریٰح بشرًا بین یدی رحمتہ ط حتّٰی اذا اقلت سحابًا ثقالا سقنہ لبلد میت فانزلنا بہ الماء فاخرجنا بہ من کل الثمرات ط (۷/۵۷)

" اُسی کی ذات ہے جو (زمین کے جُھلس جانے کے بعد) ان ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کو بھیجتی ہے جو اُس کے ابرِ کرم کی پیشوائی میں ایک حیاتِ نو کی بشارت دیتی ہیں پھر جب وہ ہوائیں' پانی سے بھرے ہوئے بادلوں کو لے کر اُڑتی ہیں تو خدا کا قانون اُنہیں زمینِ مُردہ کی طرف کھینچ کر لے جاتا ہے۔ وہاں ان بادلوں سے پانی برستا ہے جس سے' اِسی زمین مردہ سے' ہر قسم کے پھول اور پھل پیدا ہو جاتے ہیں اور ہر طرف زندگی کی نمود ہو جاتی ہے"۔

فانظر الی اٰثٰر رحمت اللہ کیف یحی الارض بعد موتھا (۳۰/۵۰)

"پس اگر تم آنکھوں میں بصارت کے ساتھ بصیرت بھی رکھتے ہو تو اللہ کے اِن آثار رحمت کو دیکھو اور غور کرو کہ وہ زمین کو اس کی موت کے بعد کس طرح حیاتِ تازہ عطا کرتا ہے۔

یہ فطرت کا نظام ہے۔ یہ اس کا قانون ہے جس کے قوانین اٹل اور جس کے آئین غیر متبدّل ہیں۔ یہ اُس کا قاعدہ ہے جس کے قواعد و ضوابط میں تبدیلی نہیں ہُوا کرتی' کہ تبدیلیاں زمان و مکان کے تغیّرات کا نتیجہ ہوتی ہیں اور اس کی ذات' زمان و مکان کی قیود سے ماوراء اور ان کے اثرات سے بے نیاز ہے۔

لیکن ان مادی تشبیہات و استعارات سے ہٹ کر ذرا دنیائے انسانیت کی طرف آیئے اور دیکھئے کہ وہاں بھی یہی اصولِ فطرت کس طرح عمل پیرا ہے۔ یہ مادی تشبیہات و استعارات بھی در حقیقت اسی مقصد کے لئے بیان کئے جاتے ہیں کہ انسان ان محسوسات کی راہوں سے مجرد حقیقتوں کی طرف آئے اور جو کچھ عالمِ آفاق میں ہو رہا ہے اس سے عالمِ انفس پر دلیل لائے۔ گذشتہ اوراق میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ آج سے چودہ سو سال پیشتر دنیائے انسانیت کی کیا کیفیت ہو چکی تھی۔ تاریخ کی یادداشتیں اس پر شاہد ہیں کہ اُس وقت عالمِ انسانیت کی خشک سالی اس سے کہیں زیادہ شدید و مہیب تھی جس کا تشبیہی منظر اُوپر پیش

کیا جا چکا ہے۔ اُس وقت شجرِ زندگی کی ہر شاخ سے نمی خشک ہو چکی تھی۔ تہذیب و تمدن کے پھول، وحشت و بربریّت کی بادِ سموم سے مُرجھا چکے تھے۔ حسنِ عمل کے زندگی بخش چشمے یکسر خشک ہو چکے تھے۔ زمین پر جوہرِ انسانیت کی سرسبزی و شادابی کا کہیں نشان تک باقی نہ تھا۔ کشتِ مذاہب و اخلاق کے حدود تو باقی تھے، لیکن فصلیں بالکل اُجڑ چکی تھیں۔ اس وحشت سراسیمگی کے عالم میں، خاسرو نامراد انسان اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا تھا لیکن خدا کی اس وسیع زمین پر اُسے کہیں زندگی کا نشان اور تازگی کا سراغ نہیں ملتا تھا۔ چاروں طرف سے مایوس و نااُمید ہو کر اُس کی نگاہیں رہ رہ کر آسمان کی طرف اُٹھتی تھیں اور ایک پکار سننے والے کو پکار پکار کر کہتی تھیں کہ متیٰ نصراللہ! یہ وقت تھا کہ فطرت کے اُس اٹل قانون کے مطابق جس کی طرف اُوپر اشارہ کیا جا چکا ہے، اِس افسردگی و پژمردگی کو پھر سے تازگی و شگفتگی میں بدل دیا جاتا۔ چنانچہ اس کے لئے اُس ربِّ ذُوالمنن کا سحابِ کرم، زندہ اُمیدوں اور تابندہ آرزوؤں کی ہزار جنتیں اپنے آغوش میں لئے، ربیع الاوّل کے مقدّس مہینے میں فاران کی چوٹیوں پر جھوم کر آیا اور بلدِ امین کی مبارک وادیوں میں کھِل کھِلا کر برسا، جس سے انسانیت کی مرجھائی ہوئی کھیتیاں لہلہا اُٹھیں۔ اخلاق و تمدن کے پژمردہ پھولوں پر پھر سے بہار آ گئی۔ عمرانیت و مدنیت کے سبزۂ پامال میں نزہت و لطافت پیدا ہو گئی، اعمالِ صالحہ کے خشک چشمے حیاتِ تازہ کے جوئے رواں میں تبدیل ہو گئے۔ طغیانی و سرکشی کی بادِ سموم، عدل و احسان کی جاں بخش نسیمِ سحری میں بدل گئی۔ فضائے عالم مسرّتوں کے نغموں سے گونج اُٹھی۔ انسان کو نئی زندگی اور زندگی کو نئے ولولے عطا ہوئے۔ آسمان نے جھک کر زمین کو مبارکباد دی کہ تیرے بختِ بلند نے یاوری کی اور تیرے خوش نصیب ذرّوں کو اُس ذاتِ ؐ و اطہرِ اعظم کی پابوسی کی سعادت نصیب ہو گئی، جو عالمِ موجودات کے سلسلۂ ارتقا کی آخری کڑی ہے۔ جس سے شرف و مجدِ انسانیت کی تکمیل ہو گئی، جو علم و بصیرت کے اُس افقِ اعلیٰ پر جلوہ بار ہے جہاں عقل و عشق، فکر و نظر، دین اور دنیا، قوسین کی طرح آپس میں ملتے ہیں۔ جو دانشِ نورانی و حکمتِ بُرہانی کے اُس مقامِ بلند پر فائز ہے جہاں غیب و شہود کی وادیاں دامنِ نگاہ میں سمٹ کر آ جاتی ہیں۔ ہاں تو، آسمان نے خوش بخت زمین کی بارگاہِ عالیہ میں جھک جھک کر ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کیا، نوامیسِ فطرت نے "جنّت سے نکالے ہوئے آدم" کے اس طالع بیدار کا تقدیس و تحمید کے زمزموں سے استقبال کیا۔ دُنیا سے طاغوتی قوتوں کے تخت اُلٹ گئے کہ وہ آنے والا آگیا جس کی آمد ملوکیت و قیصریت کے لئے پیغامِ فنا تھی۔ ایران کے آتشکدوں کی آگ ٹھنڈی پڑ گئی کہ

اب سے انسانی تصوّرات کی دنیا نار کی جگہ نُور سے معمور ہو گی۔ دنیا کے صنم کدوں کے بت پاش پاش ہو گئے کہ آج مسلکِ ابراہیمی کی تکمیل کا دن آ گیا۔ شیاطین نے پہاڑوں میں جا کر منہ چھپا لیا کہ اب جَور و استبداد کی ہر طاغوتی قوت کے رُوپوش ہونے کا وقت آ گیا۔ دُنیا سے باطل کی تاریکیاں دُور ہو گئیں کہ آج اس آفتابؐ عالمتاب کا طلوع ہؤا جس کے بھیجنے والے نے اُسے "جگمگاتا چراغ" کہہ کر پکارا "**انا ارسلنک شاھدا و مبشرا و نذیرا و داعیا الی اللہ باذنہ و سراجاً منیراً** آنے والا جس کی آمد کا مقصد یہ بتایا گیا کہ **ویضع عنھم اصرھم و الاغلل التی کانت علیھم**" (۷/۱۵۷) جب وہ آیا تو اس نے ان تمام اغلال و سلاسل کو ایک ایک کر کے توڑ دیا جن میں انسانیت جکڑی چلی آ رہی تھی۔ احبار و رُہبان کی تقلید کے اطواق و سلاسل، قیصر و کسریٰ کے استبداد کی زنجیریں، توہم پرستی کی بصیرت سوز بندشیں، تقسیمِ انسانیت کے انسانیت کُش نسلی، جغرافیائی، وطنی، غیر فطری معیار، سب ایک ایک کر کے ٹُوٹتے چلے گئے۔ اور پابندِ قفس طائرِلاہُوتی کو پھر سے آزادی کی فضائے بسیط میں، اِذن بال کُشائی عطا ہوا، اور انسان ایک مرتبہ پھر زمین پر سر اُونچا کر کے چلنے کے قابل ہو گیا۔ انسانیت کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کی سیدھی راہ مل گئی۔ عقل کو عشق کا جنون اور عشق کو عقل کی فرزانگی عطا ہوئی۔ فقر کو شکوہِ خسروی اور پادشاہی کو استغنائے فاروقی عنایت ہوا۔ یہ تھی وہ ذات گرامیؐ کہ

محبت از نگاہش پائدار است
سلوکش عشق و مستی راعیار است
مقامش عبدہٗ آمد و لیکن
جہانِ شوق را پروردگار است
ان ذلک لمحی الموتی ج۵۰/۳۰)

اس طرح وہ دلوں کی مُردہ بستیوں میں پھر سے زندگی کا سامان پیدا کر دیتا ہے۔

اسی حقیقتِ باہرہ کو بانداز گرد دیکھئے۔ آویزشِ ابلیس و آدم سے سلسلۂ رُشد و ہدایت کی ابتداء ہوئی۔ ابلیسانہ قوتوں کی تائید میں، کشش و جاذبیت کا وہ تمام نگاہ فریب سامان رنگ و تعطّر تھا جو نگار خانۂ طلسم و

حیرت کے دامن میں بھر کر رکھ دیا گیا تھا۔ دوسری طرف انسانی راہ نمائی کے لئے پیغامِ ازلی تھا جو مبداء فیض کی شانِ ربوبیت سے انسانوں تک پہنچتا رہا۔ عقلِ خودبیں طبعیاتی زندگی ہی کو سفرِ حیات کی آخری منزل قرار دے کر' اعلیٰ مقاصد اور بلند اقدار کو اس کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ لیکن یہ پیغامِ ازلی اُس کے سامنے طبیعیاتی زندگی کی آرائشوں کے ساتھ ساتھ شرفِ انسانیت کی بلند حقیقتوں کو بے نقاب کرتا تھا۔ اس پیغام کی لِم ایک تھی۔ حقیقت ایک تھی۔ لیکن جوں جوں اس طلسم کدۂ رنگ و بُو کی پیچیدگیاں بے نقاب ہوتی جاتی تھیں' اس تعلیم کی جزئیات میں مناسب ردّو بدل اور ضروری تغیّر و تبدّل ہوتا جاتا تھا' تاکہ طبعی اِرتقاء کے ساتھ ساتھ' جوہرِ انسانیت میں بھی بتدریج اِرتقا ہوتا جائے۔ یہ اِرتقائی مدارج تکمیل کی طرف بڑھ رہے تھے۔ رہروانِ شوق کا یہ کارواں سوئے منزل جادہ پیما تھا۔ ان پیغمبرانِ حیاتِ جاوید کا ہر ایک قدم ایک خاص سمت اُٹھتا اور ہر نشانِ راہ ایک آخری مستقر کی طرف اشارہ کرتا جاتا۔ چنانچہ آنے والوں میں سے جو کوئی اپنے منصب کی تکمیل کے بعد واپس جاتا تو جاتے وقت ایک آخری آنے والے کا پتہ نشان بتا کر جاتا۔ تاکہ جب وہ آنے والا آئے تو یہ قافلہ بلا تأمل و توقف اس کے پیچھے ہو لے اور راہ گم کردہ' مختلف وادیوں میں سرگرداں و حیراں نہ پھرتا رہے۔ اس لئے کہ یہ سب ایک ہی سلسلۂ زرّیں کی مختلف کڑیاں تھیں جن میں کی ہر کڑی' سلسلہ کی آخری کڑی کی روشن دلیل تھی۔ یہ سب ایک ہی کتابِ فطرت کے اوراق و ابواب تھے جن میں کا ہر ورق اور ہر باب' کتاب کے آخری باب کی تمہید تھا۔ یہ سب ایک ہی شجرِ طیّب کی شگفتہ شاخیں تھیں جو ایک گُلِ سرسبد کے لئے نویدِ بہار تھیں۔ چنانچہ جب مشیّتِ ایزدی کی یہ تدبیرِ محکم جس کے لئے زمین و آسمان قرنہا قرن سے یوں سرگرداں پھر رہے تھے' اپنی پختگی تک پہنچی۔ جب انسانیت جس کے لئے کائنات نے ایک ایک ذرّے کو لاکھوں چکّر دیئے تھے' گہوارۂ طفولیت سے حریمِ شباب میں آ گئی۔ جب اس صحیفۂ فطرت کی تکمیل کا وقت آ گیا جس کے مختلف اوراق ستاروں کی ٹھنڈی ٹھنڈی مرمریں روشنی میں کوثر و تسنیم سے دُھلے ہوئے قلم سے لکھے گئے تھے۔ جب سینۂ کائنات میں اِتنی کُشاد پیدا ہو گئی کہ وہ اپنے اندر رازہائے دردنِ پردہ کے معدنِ لعل و گوہر کو سمو لے تو آسمان کی حوریں زمین پر اُتریں کہ جنّت کے تر و تازہ پھولوں سے وادیٔ بطحا کی تزئین و آرائش کریں۔ صحنِ گلستانِ کائنات پر بہار آ گئی' ہر طرف سے مُسرّتوں کے چشمے اُبلنے لگے۔ چاند مسکرایا۔ ستارے ہنسے۔ آسمان سے نُور کی بارش ہوئی۔ فرشتوں کی معصوم نگاہوں میں **انی اعلم مالا تعلمون** کی

تفسیر' ایک پیکرِ محبوبیت کا حسین تصوّر بن کر چمکنے لگی۔ فلک تعظیم کے لئے جھکا۔ زمین نے اپنی خاک آلود پیشانی سجدہ سے اُٹھائی کہ آج اس کی قرنہا قرن کی دعاؤں کی قبولیت کا وقت آ پہنچا تھا۔ صحرائے حجاز کے ذرّے جگمگا اُٹھے۔ بلدِ امین کی گلیوں کا نصیبہ جاگا کہ آج اُس آنے والے کی آمد آمد تھی جس کی طرف جبلِ تین پر حضرت نوحؑ نے اشارہ کیا تھا اور جسے کوہِ زیتون پر حضرت مسیحؑ نے اپنے حواریوں کو وجۂ تسکین خاطر بتایا تھا۔ جس کی آمد کی بشارتیں وادئ طورِ سینین میں بنی اسرائیل کو دی گئی تھیں اور جس کے لئے دشتِ عرب میں حضرت خلیلِ اکبرؑ اور ذبیحِ اعظمؑ نے اپنے خدا کے حضور دامن پھیلایا تھا۔ وہ آنے والا کہ جس کے انتظار میں زمانہ نے لاکھوں کروٹیں بدلی تھیں' آیا اور اِس شانِ زیبائی و رعنائی سے آیا کہ زمین و آسمان میں تہنیت کے غلغلے بلند ہوئے۔ فرشتوں نے زمزمۂ تبریک گایا۔ سدرۃ المنتہیٰ کی حدود فراموش شاخوں نے جھُولا جھلایا۔ ملاءِ اعلیٰ کی مقدّس قندیلوں نے چراغاں کیا۔ کائنات کے ذرّے چمک اُٹھے۔ فضائے عالم صلوٰۃ و سلام کی فردوس گوش صداؤں سے گونج اُٹھی اور اِنس و جان وجد و کیف کے عالم میں پکار اُٹھے کہ

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا   اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا
در جہانِ ذکر و فکر و اِنس و جاں   تو صلوٰۃِ صبح' تو بانگِ اذاں

یہ آنے والا رسولؐ **کافتہ للناس** اور **رحمتہ للعالمین** بن کر آیا اور اپنے ساتھ وہ نظامِ عدل و حریّت لایا جو اِنسان کو دُنیا بھر کی غلامی سے آزادی دلانے کا کفیل تھا۔ یہ پیغام کوئی انوکھا پیغام اور یہ تعلیم کوئی نئی تعلیم نہ تھی۔ صداقت جہاں کہیں بھی تھی اُسی کتابِ مبین کا کوئی نہ کوئی ورق تھی جو محمدؐ کی وساطت سے دُنیا کو ملی۔ روشنی جس مقام میں بھی تھی وہ اُسی قندیلِ آسمانی کی کوئی نہ کوئی کرن تھی جو قلبِ نبویؐ میں اُتاری گئی۔ شامۂ جاں نواز نے جہاں کہیں بھی عطر بیزی و عنبر فشانی کی وہ لالہ و یاسمن کی ان ہی پتّیوں کی رہینِ منّت تھی جن کا گلدستہ اِس نبیٔ آخر الزمان کے مقدّس ہاتھوں محرابِ کعبہ میں رکھا گیا۔ پیغامِ محمدیؐ کیا ہے؟ اُن ہی اوراق کی شیرازہ بندی جنہیں حوادثِ اَرضی و سماوی کی تیز آندھیوں نے صحنِ کائنات میں اِدھر اُدھر بکھیر دیا تھا۔ اور مقامِ محمدیؐ کیا ہے؟ اُن ہی درخشندہ و تابندہ ذرّاتِ نادرہ کا پیکرِ حسن و زیبائی جن کی حقیقی آب و تاب کو ان کے ستائش گروں کی غلوُ آمیز عقیدت کی رنگینیوں نے مستوُر کر رکھا تھا۔ وہاں یہ

---

[1] غالباً یہ بات ڈاکٹر صاحب کے علم میں نہیں کہ علّامہ پرویزؒ نے یہ رسالہ ۱۹۳۸ء میں علّامہ اقبالؒ کے ایماء پر حضرت قائدِ اعظمؒ

اگلے صفحہ پر جاری ہے

جوہر الگ الگ پڑے تھے' یہاں ایک ایسے عدیم النظیر مصرعہ میں آب و تاب سے موزوں ہو گئے تھے جو ضمیرِ کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ موتی تھے' یہ مالا تھی۔ وہ پتّیاں تھیں یہ پھول تھا۔ وہ ذرّے تھے' یہ چٹان تھی۔ وہ قطرے تھے یہ سمندر تھا۔ وہ ستارے تھے یہ کہکشاں تھی۔ وہ افراد تھے' یہ ملّت تھی۔ وہ نقطے تھے' یہ خطِّ مستقیم تھا۔ وہ ابتداء تھی' یہ انتہا تھا۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتد است
رحمتہً للعالمینی انتہا است

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا' شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لئے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دے دیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادئ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقامِ بلند تک پہنچنے کے لئے وہی ایک صراط مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس و اعظم کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ ور پکار اُٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق' دل بندو راہِ مصطفٰے رو

یہ تھا حاصلِ بہارِ چمنِ کائنات' کہ جس کا ظہور' صُبحِ بہارِ کائنات تھا۔

وہ رازِ خلقتِ ہستی' وہ معنئ کونین
وہ جانِ حُسن ازل وہ بہارِ صُبحِ وجود
وہ آفتابِ حرم' نازنینِ کُنجِ حرا
وہ دل کا نور وہ اربابِ درد کا مقصود
وہ سرورِ دو جہاں وہ محمد عربی
بروحِ اعظم و پاکش درود لا محدود
ان اللہ و ملا ئکتہ' یصلون علی النبیؕ
یا یھا الذین امنو ا صلوا علیہ وسلموا تسلیما o
(۳۳ : ۵۶)

کی زیرِ ہدایت از سرِ نو اس لئے جاری کیا تھا کہ تحریکِ حصولِ پاکستان کی نیشنلسٹ علماء کے گروپ کی طرف سے مخالفت کا سدِّ باب کیا جائے۔

کتاب و سنّت

کتاب و سنّت پر لب کشائی سب سے زیادہ نازک ہے، اس لئے کہ مذہبی پیشوائیت نے مسلسل پراپیگنڈہ سے عوام کے جذبات کو اس قدر مشتعل کر رکھا ہے کہ اس سلسلہ میں لب کشائی سے ہر ایک ڈرتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا کہ اس میں اسلامی قوانین نافذ ہوں لہٰذا تشکیل پاکستان کے بعد سب سے پہلا مرحلہ یہ سامنے آیا کہ اسلامی قوانین وضع کس طرح کئے جائیں۔ ہمارے علماء کرام نے مطالبہ کیا کہ اس مقصد کے لئے آئین میں یہ شق رکھی جائے کہ مملکت کا کوئی قانون، کتاب و سنّت کے خلاف نہیں ہوگا۔ میں نے کہا کہ یہ مطالبہ ناممکن العمل ہے۔ کتاب و سنّت کے مطابق کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکے گا جو تمام فرقوں کیلئے قابلِ قبول ہو۔ اس پر ان حضرات نے یہ ترمیم کی کہ پرسنل لاز ہر فرقے کے الگ الگ ہوں .... اور پبلک لاز کا مجموعہ کتاب و سنّت کے مطابق مدوّن کر لیا جائے۔ میں نے کہا کہ اوّل تو پرسنل لاز کی یہ تفریق خود کتاب و سنّت کے خلاف ہے۔ نہ قرآن کریم نے ان میں کوئی تخصیص کی ہے اور نہ ہی عہد رسالتمآبؐ اور دورِ خلافت راشدہ میں ان میں کوئی تفریق تھی۔ دوسرے یہ کہ کتاب و سنّت کے مطابق پبلک لاز کا بھی کوئی ایسا ضابطہ مدوّن نہیں ہو سکے گا جسے تمام فرقے متفق طور پر اسلامی تسلیم کر لیں۔ اس کا جواب ان حضرات کے پاس کوئی نہیں تھا۔ بجز اس کے کہ میرے خلاف پراپیگنڈہ کیا جائے کہ یہ شخص منکرِ حدیث ہے۔ منکرِ شانِ رسالتؐ ہے۔ ایک الگ فرقہ ایجاد کرنا چاہتا ہے۔ ملحد ہے۔ بے دین ہے اور نہ جانے کیا کیا ہے۔ اس پراپیگنڈہ میں جماعت اسلامی پیش پیش تھی۔ اور چونکہ پراپیگنڈا کے فن میں یہ لوگ بڑے ایکسپرٹ ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کا یہ حربہ بڑا کامیاب رہا، اس حد تک کامیاب کہ آج آپ کسی کے سامنے پرویز یا طلوعِ اسلام کا نام لے لیجئے وہ کانوں پر ہاتھ دھرنے لگ جائے گا خواہ اس کے فرشتوں کو بھی علم نہ ہو کہ پرویز کیا کہتا ہے اور طلوعِ اسلام کی دعوت کیا ہے۔ بیس بائیس سال تک یہ پراپیگنڈا مسلسل و متواتر جاری رہا۔ اس کے بعد آپ کو معلوم ہے کیا ہوا؟ ہوا یہ کہ اس جماعت کے امیر، سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کو اعلان کرنا پڑا کہ یہ حقیقت ہے کہ:

"کتاب و سنّت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں جو پبلک لاز کے معاملے میں حنفیوں، شیعوں اور اہلحدیث

کے درمیان متفق علیہ ہو۔

(ایشیاء ۲۳ اگست ۱۹۷۰ء)

یعنی وہی بات جو کافر، مرتد، ملحد و بے دین "پرویز" بیس برس سے کہہ رہا تھا۔ اس کا اعتراف و اعلان ان حضرات کو بھی کرنا پڑا (میں سمجھتا ہوں کہ مودودی صاحب پہلے دن سے اس بات کو جانتے تھے لیکن پرویز کے خلاف پراپیگنڈہ ایک خاص مقصد کے تحت کیا جا رہا تھا۔)

اس کے بعد سوال یہ پیدا ہوا کہ جب کتاب و سنت کے مطابق کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو، تو پھر اسلامی قوانین مرتب اور رائج کیسے ہوں۔ اس کا جواب مودودی صاحب نے یہ دیا کہ ملک میں اکثریت حنفیوں کی ہے۔ اس لئے فقہ حنفی کو ملک کے قانون کی حیثیت سے نافذ کر دیا جائے۔ یہ وہی فقہ حنفی ہے جس کے متعلق مودودی صاحب خود فرما چکے تھے کہ

"اس میں اسلامی شریعت کو ایک منجمد شاستر بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ اس میں صدیوں سے اجتہاد کا دروازہ بند ہے۔ جس کی وجہ سے اسلام ایک زندہ تحریک کے بجائے محض عہد گذشتہ کی ایک تاریخی تحریک بن کر رہ گیا ہے۔"

(سیاسی کشمکش حصہ سوم صہ ۳۶)

مودودی صاحب کی اس تجویز کے خلاف سب سے پہلے شیعہ حضرات نے صدائے احتجاج بلند کی اور مرکزی ادارہ تحفظ حقوق شیعہ نے ایک قرارداد منظور کی جس میں کہا کہ:

"شیعان پاکستان کسی ایسے پرسنل لاء یا پبلک لاء کو تسلیم نہیں کریں گے جس میں اہل تشیع کے سیاسی مذہبی اور معاشرتی حقوق کے تحفظ کی ضمانت نہ دی گئی ہو۔"

(بحوالہ مساوات ۲۹/۶)

یہ تھا شیعہ حضرات کا ردعمل مودودی صاحب کی تجویز کے خلاف۔ اب سنیوں کی طرف آئیے۔ سنیوں میں اہلحدیث اور اہل فقہ، دو بنیادی فرقے ہیں۔ اہل حدیث نے اس تجویز کی شدت سے مخالفت کی اور کہا کہ فقہ حنفی ایک خاص فرقہ کی فقہ ہے جسے ہم تسلیم نہیں کرتے۔ اس لئے وہ فقہ ملک کے اسلامی قوانین کی حیثیت سے ہمارے نزدیک قابل قبول نہیں ہوگی۔ (ملاحظہ ہو، اہل حدیث کے ترجمان الاعتصام کی ۲۵ ستمبر ۱۹۶۴ء کی اشاعت) خود حنفیوں میں دیوبندی اور بریلوی۔ دو ذیلی فرقے ہیں۔ سرحد کے حالیہ وزیر اعظم، مفتی محمود صاحب کا تعلق دیوبندی فرقہ سے ہے۔ انہوں نے اپنے صوبے میں جس اسلامی شریعت کا اجراء شروع کیا ہے، اس کے متعلق حنفیوں کی اس دوسری شاخ کی طرف سے احتجاج ہو رہا ہے کہ:

"مفتی صاحب دیوبندیت کو مسلط کرنے کیلئے اپنے اقتدار کو استعمال کر رہے ہیں۔" (تنظیم اہلحدیث ۱۳ اکتوبر ۱۹۷۲ء)

آپ کو معلوم ہے کہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں اس اختلاف کی بنیادی وجہ کیا ہے؟ وجہ یہ ہے کہ جس طرح لفظ "مسلمان" کا کوئی متفق علیہ مفہوم متعین نہیں۔ اسی طرح لفظ "سنّت" کا بھی کوئی ایسا مفہوم متعین نہیں جو سب کے نزدیک متفق علیہ ہو۔ اہل حدیث حضرات کے نزدیک نبی اکرمؐ کی ہر حدیث، سنّت ہے۔ اس کے برعکس مودودی صاحب کا ارشاد ہے کہ سنّت اس طریق عمل کو کہتے ہیں جس کے سکھانے اور جاری کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مبعوث کیا تھا۔ اس سے شخصی زندگی کے وہ طریقے خارج ہیں جو نبی نے بحیثیت ایک انسان ہونے کے یا بحیثیت ایک ایسا شخص ہونے کے جو انسانی تاریخ کے ایک خاص دور میں پیدا ہوا تھا، اختیار کئے۔" (رسائل و مسائل حصہ اوّل صفحہ ۳۱۷، ۳۱۱)

اس کے خلاف اہل حدیث حضرات نے کہا کہ:

"ہم آخری حد تک اس کی مزاحمت کریں گے اور سنّت رسولؐ کو ان حملوں سے بچانے کی کوشش کریں گے۔"
(جماعت اسلامی کا نظریۂ حدیث صفحہ ۶۳)

"سنّت" کی جو تعریف، اہل حدیث حضرات نے پیش کی تھی اس کے متعلق مودودی صاحب نے کہا کہ:

"میں عقیدہ رکھتا ہوں کہ اس قسم کی چیزوں کو سنت قرار دینا اور پھر ان کے اتباع پر اصرار کرنا ایک سخت قسم کی بدعت اور خطرناک تحریف دین ہے۔" (ایضاً صفحہ ۳۰۸)

یہ تو رہی "سنّت" کی DEFINITION۔ اب آیئے "سنّت" کے ماخذ یعنی احادیث کی طرف۔ سو سب سے پہلے تو یہ معلوم ہے کہ سنیوں کے احادیث کے مجموعے الگ ہیں اور شیعہ حضرات کے الگ۔ پھر سنیوں میں اہل حدیث کا عقیدہ یہ ہے کہ بخاری اور مسلم کی تمام احادیث کی صحت قطعی ہے۔ ان کا انکار کفر ہے۔ اور ملّت سے اخراج کے مرادف۔ (جماعت اسلامی کا نظریۂ حدیث صفحہ ۴۸ ز ۵۵) یعنی بخاری اور مسلم کی کسی ایک حدیث کا انکار کرنے والا دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔

اور مودودی صاحب فرماتے ہیں:

"یہ دعویٰ کرنا صحیح نہیں کہ بخاری میں جتنی احادیث درج ہیں۔ ان کے مضامین کو جوں کا توں بلا تنقید قبول کر لینا چاہیئے" (ترجمان القرآن اکتوبر نومبر ۱۹۵۲ء)

یہ کیفیت ہے سنّت اور اس کے ماخذ احادیث کے متعلق اختلافات کی۔

لیکن اس داستان کا سب سے دلچسپ باب ابھی سامنے نہیں آیا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ مودودی صاحب نے کہا ہے کہ کتاب وسنّت کے مطابق کوئی ایسا مجموعۂ قوانین مرتّب نہیں ہو سکتا جو سب فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو اس کے باوجود انہوں نے حکومت سے کہا ہے کہ مستقل آئین میں یہ شق درج ہونی چاہیئے کہ مملکت کا کوئی قانون کتاب وسنّت کے خلاف نہیں ہوگا۔ یعنی جس چیز کے متعلق خود اعتراف ہے کہ ایسا ہونا ناممکن ہے حکومت سے مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ اس ناممکن کو ممکن بناؤ۔ اور اس مطالبہ کی شدت کا یہ عالم ہے کہ حال ہی میں صوبہ پنجاب کی جماعت اسلامی کے امیر سید اسعد گیلانی نے ایک بیان میں کہا ہے کہ اگر قرآن وسنّت کے مبنی قوانین کا اجراء نہ کیا گیا تو:

"جماعت اسلامی فی الحقیقت ملک بھر میں ایسی تحریک چلائے گی جس کی لہر خیبر سے کراچی تک نظر آئے گی۔"

(نوائے وقت ۱۶/۱۰/۷۲)

یہ ہے برادرانِ عزیز! وہ خونچکاں کھیل جو ملک میں کتاب وسنّت کے نام پر کھیلا جا رہا ہے۔ مقصد اس کا واضح ہے یعنی:

جب کتاب وسنّت کے مطابق کوئی متفق علیہ ضابطۂ قوانین مرتّب ہو نہیں سکے گا تو حکومت کے خلاف ایجی ٹیشن کرنے کا نہایت "معقول" عذر ہاتھ آجائے گا کہ یہ لوگ اسلامی قوانین نافذ نہیں کرنا چاہتے۔

۲ سنّت کے اختلاف کی بنا پر ملک کے مختلف فرقوں میں سر پھٹول جاری رہے گی اور

۳ نوجوان طبقہ کے دل میں یہ خیال راسخ ہو جائے گا کہ اسلام کے مطابق کوئی حکومت قائم نہیں ہو سکتی اس لئے یہاں سیکولر اسٹیٹ قائم ہونی چاہیئے۔

میں پہلے دن سے یہ کہتا چلا آ رہا ہوں کہ ان تمام اختلافات کے باوجود مسلمانوں کے تمام فرقوں میں کم از کم ایک قدر مشترک موجود ہے اور وہ ہے خدا کی کتاب جس پر ہم سب کا ایمان ہے۔ پاکستان (یا کسی اور ملک میں) اسلامی حکومت صرف اس صورت میں قائم ہو سکے گی کہ قرآن کریم کو بنیاد قرار دیکر حکومت ایک ضابطۂ قوانین مرتّب کرے جس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہو۔ جب اس طرح مرتّب کردہ قوانین کی سند قرآن کریم کے احکام وفیصلوں ہوں گے تو کسی مسلمان کو اس سے اختلاف کی مجال نہیں ہو سکے گی۔ اس تجویز کے خلاف یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کریم تمام فرقوں میں قدر مشترک ہے لیکن قرآن کی تعبیر ہر فرقہ کی اپنی اپنی ہے۔ اس کا کیا علاج ہوگا۔ ایسا کہنے والے یہ نہیں سوچتے کہ تعبیر کا اختلاف اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب مختلف فرقوں کو تعبیر کا حق انفرادی طور پر دے دیا جائے۔ لیکن اگر یہی تعبیر اسلامی حکومت کی طرف سے ہو تو اس میں اختلاف کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ قانون کے مقصد کیلئے اسلامی حکومت کی تعبیر سب کے نزدیک قابل قبول ہونی چاہیئے۔ اس کے علاوہ نہ اسلامی حکومت کے قیام کی کوئی صورت ہو سکتی ہے نہ اسلامی قوانین کی ترتیب واجراء کی کوئی شکل۔

(ماخوذ از طلوع اسلام جنوری ۱۹۷۳ء)

مجلسِ استفسارات

تحریکِ طلوعِ اسلام کے بزرگ کارکن میجر جنرل (ریٹائرڈ) جناب احسان الحق ملک صاحب سے کراچی میں پوچھے گئے چند سوالات اور ان کے جوابات قارئینِ طلوعِ اسلام کے استفادہ کے لئے شاملِ اشاعت ہیں۔ ان موضوعات پر احباب مزید وضاحت سے لکھنا پسند فرمائیں تو طلوعِ اسلام کے صفحات حاضر ہیں۔ (ایڈیٹر)

سوال:۔ دنیا میں ہر سو ناانصافی نظر آتی ہے (غربت، بیماری، حادثات، ظلم، آفات وغیرہ) کچھ تو انسان کی خود پیدا کردہ ہے لیکن کچھ "قدرت" کی بھی عطا ہے۔ اگر اللہ رحیم ہے تو ایسا کیوں ہے۔

جواب:۔ سوچنے والے ابتدائے تہذیب سے یہ سوال کرتے چلے آئے ہیں۔ قرآنِ کریم کے مطابق اللہ تعالیٰ نے انسان کو "احسن تقویم" میں پیدا کیا ہے، یعنی انسان میں یہ صلاحیت رکھ دی گئی ہے کہ وہ اپنی ذات کی نشوونما کر کے حسن کارانہ انداز سے بہترین توازن کی زندگی بسر کر سکے۔ ذات کی نشوونما کے لئے اسے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں قرآنِ کریم کی دی ہوئی ہدایت کے مطابق عمل کرنا ہوگا۔ اگر وہ ایسا کرتا ہے، تو اللہ تعالےٰ ایک جنتی معاشرے (اس دنیا میں اولاً) کا وعدہ کرتا ہے جس میں کوئی ناانصافی نہیں ہوگی۔ غربت، بیماری، حادثات، ظلم، یہ سب انسان کے پیدا کردہ ہیں۔ تاریخ میں ایسے دو ادوار گذرے ہیں جب ان ناانصافیوں سے کافی حد تک نجات مل گئی تھی۔ اس وقت بھی ایسے ممالک موجود ہیں جہاں ناانصافیاں کم مقدار میں ہیں اور مزید بہتری کی توقع ہے۔ قرآنِ کریم OPTIMISM کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اللہ رحیم ہے کائنات میں ہر جہت سامانِ نشوونما وافر مقدار میں دے دیا گیا ہے انسان

میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے مفت دیئے گئے سامانِ نشوونما سے بہترین قسم کی اشیائے خوردنوش و رہائش، صحت، تعلیم وغیرہ کی تخلیق کر سکے اور اس انصاف کے ساتھ اس رزقِ کریم کی تقسیم ہو کہ ہر کہ دمہ کو کم از کم اس کی بنیادی ضروریات فراہم کی جا سکیں۔

آفات، جیسے زلزلے طوفانِ باد و باراں، سیلاب وغیرہ ابھی تک انسان کے مکمل قابو میں نہیں آ رہے، لیکن قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان ان کی بھی تسخیر کر لے گا۔ کچھ عجب نہیں کہ سائنسدان ان SO CALLED آفات کو فون کا ایک سرچشمہ بنالیں اور پھر جن کو اب آفات کہا جاتا ہے ان کو دھونڈا جائے کہ اشیاء کی تخلیق میں اُن قوتوں کی مدد لی جائے۔ پنجاب کے علاقے میں بارش کے موسم میں اکثر سیلاب آیا کرتے تھے اور ہم زیادہ پانی کی شکایت کیا کرتے تھے۔ امریکہ کے ماہرین نے مطالعے کے بعد بتایا کہ پانی زیادہ نہیں، کم ہے۔ چنانچہ منگلا اور دیگر ڈیم تعمیر کئے گئے۔ پانی استعمال کے لئے زیادہ مقدار میں ملنے لگ گیا۔ سیلابوں میں کمی آگئی اور اب کالا باغ ڈیم کا انتظار ہو رہا ہے تاکہ رہے سہے سیلاب بھی ختم ہو جائیں اور یوں آفات کو انسانی کاوش سے سامانِ نشوونما کا ذریعہ بنا لیا جائے۔

سوال:۔ اللہ کی ہستی پر ایمان اور اس سے "محبت" کرنے سے انسان کو کیا فائدہ پہنچتا ہے؟ اگر ایسا نہ ہو تو کیا نقصان ہوگا؟

جواب:۔ قرآنِ کریم ہمیں اللہ تعالےٰ کی "ہستی" پر ایمان لانے کو ہی نہیں کہتا وہ کائنات میں انتظام و انصرام کا مشاہدہ کرنے کو بھی کہتا ہے اور بار بار اشارہ کرتا ہے کہ دیکھئے دن رات کا اختلاف، بارش کا انتظام سمندروں اور لہروں کی پیہم حرکت، سورج چاند ستاروں کی گردش کس خوبی اور اہتمام سے جاری و ساری ہے۔ اس نظام میں ایک ربط ہے۔ یہ ایک متعین طریقے سے چلتا ہے جس میں سرِ مو کوئی فرق نہیں آتا۔

یہ نظام کائنات میں انسانوں سمیت ہر چیز کے لئے باعثِ رحمت ہے۔ ظاہر ہے خارجی کا یہ سارا نظام انسان کا پیدا کردہ تو نہیں ہے۔ جس طرح خارجی کائنات میں لگے بندھے قانون ہیں اور پوری کائنات انہی قوانین کے تحت جاری و ساری ہے۔ اسی طرح انسان کی داخلی زندگی کو بھی خدائی اصولوں کے ماتحت چلانا چاہیئے تاکہ معاشرے میں امن و امان رہے۔ جس INSTITUTION نے (اسے کوئی نام دے لیجئے) خارجی کائنات کو اصول دیئے ہیں۔ اسی نے انسان کو اس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی امن و امان سے بسر کرنے کے لئے ایک VALUE SYSTEM دیا ہے۔ ہمیں ان بلند اقدار پر ایمان اور ان کی پیروی کرنے کے لئے کہا جا رہا ہے۔ اس نظام کو تخلیق کرنے والے کی ماہیت کو دریافت کرنے کے لئے کہا جا رہا۔ اس

کے برعکس ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ کیونکہ خدا کے مثل کوئی چیز ہے ہی نہیں اس لئے تم خدا کی "ہستی" کا ادراک کر ہی نہیں سکتے۔ اس کاوش میں کیوں وقت ضائع کرتے ہو۔ وقت کا صحیح استعمال یہ ہے کہ خدا کی دی ہوئی بلند اقدار کے اندر رہتے ہوئے اپنے معاشرے کے لئے اپنے زمان و مکان کی ضرورت کے مطابق لوگوں کے مشورے کے ساتھ اچھے قانون بناؤ جن کی پیروی سے معاشرے میں انصاف اور امن و امان پیدا ہو۔ اللہ تعالےٰ کی "ہستی" نہیں۔ اس کے اسمائے حسنیٰ (IDEAL CHARACTER TRAITS) کو علیٰ حدِ بشریت اپنے اور معاشرے کے اندر منعکس کر کے ایک جنتی معاشرہ ترتیب دو۔

یہ بلند اقدار دینے والا، اتنا اچھا مشورہ مفت دینے والا کتنا اچھا ہے۔ اس سے کیوں نہ پیار کیا جائے۔ قرآن کریم کی رُو سے اللہ تعالےٰ سے محبت کا مطلب ہے، اس کی دی ہوئی بلند اقدار کی روشنی میں وضع شدہ قوانین کی پیروی کر کے اپنی زندگی کو خوبصورت بنانا۔ یہ لیلےٰ مجنوں والی محبت نہیں ہے۔ اگر یہ دیکھنا ہو کہ خدا سے زیادہ محبت کس کو ہے تو یہ دیکھو کہ اس کے قوانین پر سب سے بڑھ چڑھ کر کون عمل کرتا ہے وہی خدا کا سچا "عاشق" ہے۔ بات سے بات نکلی ہے تو "عاشقِ رسولؐ" بھی وہی ہے جو نبیٔ اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ کے اصولوں کو اپنے زمانے کی ضروریات کے مطابق اپنے آپ میں ڈھالے۔ یہ عمل کی طرف دعوت ہے نعت کہنے کو نہیں کہا جا رہا۔

اللہ تعالےٰ کی دی ہوئی بلند اقدار کے مطابق عمل کرنے سے فائدہ یہ ہے کہ (اوّلاً اس دنیا میں) ایک جنتی معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ عمل نہ کرنے کا نقصان یہ ہے کہ انسان اپنے لئے ایک جہنمی دنیا بنا لیتا ہے جہنم دیکھنے کا شوق ہے تو کراچی آجائیں، لیاری لے چلوں گا اور جنت کی ایک جھلک دیکھنی ہے تو سوئٹزرلینڈ آئیں کہ بقول علامہ اقبالؒ۔

فردوس جو تیرا ہے کسی نے نہیں دیکھا
افرنگ کا ہر قریہ ہے فردوس کی مانند

سوال:۔ کیا قرآن اور دوسری الہامی کتابیں واقعی اللہ نے اپنے نبیوں پر منکشف کی ہیں؟ تاکہ انسان کو ہدایت پہنچائے؟ دنیوی فلسفے بھی تقریباً انہیں اقدار اور اصولوں پر پہنچے ہیں، جو قرآن میں ملتے ہیں۔ پھر قرآن پر ایمان سے کیا فائدہ ملتا ہے؟

جواب:۔ قرآن کریم کے مطابق یہ صحیح ہے کہ قرآن اور دیگر الہامی کتابیں اللہ تعالےٰ نے نبیوں پر وحی کی ہیں۔ ابتدائے تہذیب سے اللہ تعالیٰ نے بلند اقدار نبیوں کے ذریعے لوگوں کو دی ہیں۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ ہم نے ہر زمان میں، ہر قوم کی طرف رسول بھیجے۔ کچھ کا ذکر قرآن میں ہے اور کچھ کا نہیں۔ حضرت ابراہیمؑ، موسیٰؑ

عیسےٰؑ، کے علاوہ مہاتما بدھ، کنفیوشش اور زرتشت بھی خدا کے نبی ہو سکتے ہیں۔ آخر ہندوستان، چین، اور ایران سے کیا لغزش ہوئی ہوگی کہ ان کی طرف انبیاء نہ بھیجے جاتے۔ یہ صحیح ہے کہ قرآن کریم کے مطابق قرآن کے سوا سب انبیا کی کتابوں میں تحریف ہوئی ہے اور وہ اب اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں ہیں۔ وحی کی روشنی کے علاوہ انسان کی اپنی عقل میں بھی یہ استعداد ہے کہ وہ اپنے تجارب اور اپنی سوچ سے اعلیٰ اقدار بنا سکے، لیکن عقل چونکہ مفادِ خویش کی غلام ہے اس لئے ایک (OBJECTIVE VALUE SYSTEM) بنانا اس کے لئے مشکل ہے۔

انسانوں کے بنائے ہوئے فلسفوں میں دو (HANDICAPS) ہیں۔ ایک تو یہ کہ انسان زمان و مکان میں مقید ہے لہٰذا اس کی سوچ ایک وقت تک کے لئے ہی ہو سکتی ہے، ابدالآباد تک کے لئے نہیں دوسرے یہ کہ وہ بہرحال اپنی عقل سے سوچے گا اور عقل خود ہیں کے لئے مفادِ خویش سے بلند ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ اسی لئے انسانی سوچ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ OUT OF DATE ہو جاتی ہے۔ مغرب کے بڑے بڑے فلاسفر افلاطون، ارسطو، والٹیئر، سپینورا، کانٹ، برگسان، نیٹشے، رسل وغیرہ وقت سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ یہ بالکل صحیح نہیں ہے کہ وہ بھی انہیں بلند اقدار کے داعی ہیں، جن دعوت قرآن دیتا ہے۔ تفصیل میں کیا جاؤں۔ WILL DURANT کی THE STORY OF PHILOSPHY اگر ایک دفعہ نظر سے گذری ہے تو اسے پھر دیکھئے۔ قرآن پر ایمان سے دو فائدے ملتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کی دی ہوئی بلند اقدار ابدالآباد کے لئے ہیں کیونکہ ان کا دینے والا زمان و مکان کی قید میں نہیں ہے اور دوسرا یہ کہ یہ ایک OBJECTIVE VALUE SYSTEM ہے۔ اس کے مصنف کی کوئی VESTED INTEREST نہیں ہے کہ وہ مفادِ خویش کا تحفظ ذہن میں رکھ کر قوانین بنائے۔ معاشی نظام کا اصول ہی دیکھئے کہ کماؤ، خوب کماؤ، اپنی جائز ضروریاتِ زندگی کو پوری کرو اور باقی ماندہ کائنات کی بھلائی کے لئے چھوڑ دو۔ اب کسی کھاتے پیتے آل اولاد والے انسان سے یہ توقع رکھنا کہ وہ مفادِ خویش سے قطع نظر یہ اصول وضع کرے گا۔ ذرا زیادتی ہے۔ اللہ تعالےٰ کو بہرحال یہ ADVANTAGE ہے کہ اس کی کوئی ذاتی ضرورت ہے ہی نہیں۔ انسان سے بھی یہی کہا گیا ہے کہ اس قسم کا کردار پیدا کرو کہ تمہاری ذاتی ضروریات کم سے کم ہوں۔ زیادہ سے زیادہ مال پیدا کر کے اسے کائنات کی بھلائی کے لئے کھلا چھوڑ دو تاکہ ایک جنتی معاشرے کا قیام ممکن ہو سکے جس کے نتائج سے تم خود بھی مستفید ہو گے۔

سوال:۔ اس دنیا کی پیدائش کی کیا غرض ہے؟

جواب:۔ قرآنِ کریم کے مطابق اللہ تعالےٰ کی اپنی ذات مکمل اور بلند ترین ہے۔ کائنات میں صرف انسان کو حقِ خودارادیت اور ذات (PERSONALITY) عطا ہوئی ہے۔ البتہ یہ غیر نشوونما یافتہ (UNDEVELOPED FORM) شکل میں ہے۔ ذاتِ خداوندی کے کچھ گوشے تو صرف خدا کے مخصوص ہیں (احد، اوّل، آخر وغیرہ) لیکن دوسری صفات ایسی ہیں جو حدودِ بشریت کے اندر انسانی ذات میں منعکس ہو سکتی ہیں۔ انسان اپنی انفرادی اور اجتماعی کاوش سے اپنے اندر اسماء الحسنیٰ کی جھلک پیدا کر سکتا ہے اور قرآنِ کریم کی رُو سے کائنات کی تخلیق کی غرض یہ ہے کہ جو انسان یہ کوشش کرے اس کی مدد کی جائے۔ چنانچہ جب انسان اس سعی و کاوش میں مصروف ہوتا ہے تو اللہ تعالےٰ کی تمام قوتیں (ملائکہ) اس کے ساتھ ہوتی ہیں۔ جب سے تہذیب و تمدن کا دَور شروع ہوا ہے انسان نے ملائکہ کے ساتھ ہم آہنگی اور ان کی تسخیر کے ساتھ ایک بلند سے بلند مرتبہ حاصل کیا ہے۔ کم از کم سائنسی میدان (تسخیرِ کائنات) میں اس کی ترقی قابلِ صد ستائش ہے۔ اس ترقی کی رفتار سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسانی زندگی ابھی بہت اوپر جائے گی۔ جہاں تک بھی انسان پہنچے گا وہ کائناتی قوتوں کو اپنے سے آگے پائے گا کہ "آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکون"۔ کرنے کا کام یہ ہے کہ خارجی کائنات میں تسخیرِ کائنات سے جو سامانِ نشوونما پیدا کیا جائے اس کی تقسیم بھی اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی بلند اقدار کے مطابق ہو۔ ایسا ہو گا تو پھر بقول قرآنِ کریم "یہ کائنات تیرے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی"۔ نوٹ کیجئے قرآن OPTIMISM کی طرف اشارہ کر رہا ہے، توڑ پھوڑ کی طرف نہیں۔ یہ ہندو عقیدہ ہے کہ دنیا رام لیلا ہے۔ ایک دن بھگوان کھیل سے اکتا کر اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائی جانے والی قیامت کا تصور اس سے مختلف ہے۔ تخلیقِ کائنات کی ایک مثبت غرض ہے اور وہ ہے عروجِ آدمِ خاکی۔ اس وقت تک اپنے اعمال کے نتیجے میں انسان اس موجودہ گلوب کو ناقابلِ رہائش بنا چکا ہو گا اور اہلِ نظر نئی بستیاں آباد کر چکے ہوں گے۔

سوال:۔ کیا حیات بعد الموت اور اس میں جزا و سزا کی کوئی حقیقت ہے؟

جواب:۔ قرآنِ حکیم میں حیات بعد الموت کا تصریحاً ذکر ہے۔ وہاں کس ہیئت میں اور کس قسم کی زندگی ہو گی اور جزا و سزا کی کیا EXACT شکل ہو گی۔ اس کی تفصیل نہیں دی گئی کیونکہ عقل کی موجودہ سطح پر اس کا ادراک ہی نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا کی جنت اور دوزخ کا تو بہت تفصیل سے ذکر ہے۔ موت کے بعد کی جنت صرف مثال کے ذریعے سمجھائی گئی ہے۔ ارشادِ باری تعالےٰ ہے: "جس جنت کا متقین سے وعدہ کیا گیا ہے اس کی مثال ایسی ہے....." (قرآن) اور پھر ان محسوس چیزوں کی مثال دی گئی ہے جنہیں ہم یہاں دیکھتے اور EXPERIENCE کرتے ہیں۔

جہاں تک جزا و سزا کا تعلق ہے، تو قرآن حکیم کے مطابق ہر عمل کی جزا و سزا تو اس عمل کے اندر ہی شامل ہوتی ہے۔ نہ سزا خارجی طور پر ملتی ہے اور نہ جزا ہی کہیں باہر سے انعام ملنے کا نام ہے۔ ایک اسلامی نظام میں دنیا میں آپ جتنے کام کرتے ہیں ان کی جزا و سزا یہیں مرتب ہوتی ہے بلکہ ایک اچھے معاشرے کی پہچان ہی یہی ہے کہ جزا و سزا میں دیر نہ ہو۔ یہ عمل کے ساتھ ہی منسلک ہو۔ آپ نے اکثر سنا ہے JUSTIGE DELAYED IS JUSTICE DENIED۔ یہی قرآن کریم کا تصور ہے۔ اگر اس دنیا میں کئے گئے اچھے یا بُرے کاموں کی جزا و سزا موت کے بعد کی زندگی میں اللہ تعالےٰ ہی نے دینی ہے تو ہمارے اولی الامر تنخواہ کس کام کی لیتے ہیں۔

آپ نے آگ میں ہاتھ ڈالا، ہاتھ جل گیا۔ کسی پولیس والے نے تو نہیں سزا دلوائی۔ آپ نے ٹیکس کی چوری کی۔ فوراً آپ کی ذات پر اثر ہو گیا۔ آپ چھوٹے آدمی بن گئے۔ اگر دھاندلی سے آپ نے سزا نہیں بھی ہونے دی تو بھی آپ کی ذات پر اثر فی الفور مرتب ہو گیا۔ آپ نے ضرورت سے زائد آمدنی کائنات کے مفاد کے لئے کھلی چھوڑ دی۔ اسی وقت آپ کی ذات (خودی) بلند ہو گئی۔ اچھے اولی الامر ہونے کی ضرورت اس لئے ہے کہ معاشرہ بھی اچھے اور بُرے کام کو RECOGNISE کرے اور بوقت ضرورت اور بغرضِ اصلاح بُرے کام کی سزا دے اور اچھے کام کی جزا دے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اچھے کام کرنے اور بُری کاموں سے رُکنے کی ترغیب دے۔

یہ صحیح نہیں ہے کہ اللہ تعالےٰ نے کہیں بُرے لوگوں کے لئے آگ کے تنور تیار کر رکھے ہیں۔ ہاں اگر کوئی شخص مناسب مقدار میں اچھے کام نہیں کرتا تو اس کی نشوونما رُک جاتی ہے۔ وہ موت کے بعد کی زندگی کے لئے QUALIFY ہی نہیں کرتا۔ اس کو جہنم کہتے ہیں۔ یعنی GROWTH کا رُک جانا۔ اس سے بڑی اور کیا سزا کیا ہو سکتی ہے کہ ایک انسان کی DEVELOPEMENT رُک جائے۔ QUALIFY کرنے والے ایک HIGHER LIFE کے حق دار ہیں (موت کے بعد زندگی والی جنت) جہاں "ان کے لئے ہو گا جو وہ چاہیں گے بلکہ اس سے بھی زیادہ ہو گا" (قرآن) اس بلند زندگی میں ہمارے لئے کیا کیا چیز وجہ مسرت ہو گی۔ عقل کی موجودہ سطح پر ہم اس کا ادراک نہیں کر سکتے۔ یاد رکھئے۔

(YOU CAN ONLY CONCEIVE WHAT YOU CAN PERCEIVE)

سوال:۔ اگر اللہ کی ہدایت مکمل ہو چکی ہے تو کیا اللہ "ریٹائر" ہو چکا ہے اور اب اس کا بندوں سے کوئی تعلق نہیں؟ اگر ہے تو کیا یہ تعلق ذاتی اور انفرادی بھی ہے یا فقط قوانینِ قدرت جاری رکھنے تک محدود ہے؟

جواب:۔ اللہ تعالےٰ نے اپنی سنّت کے مطابق ابتدائے تہذیب سے مختلف اقوام کی طرف انہیں قوموں کے منتخب بندوں کی وساطت سے اپنی بلند اقدار بھیجیں تاکہ ان کی روشنی میں انسان ایک توازن بدوش خوشحال معاشرے کا قیام کرسکیں۔ عالم طفولیت سے انسانیت بلوغت کی طرف بڑھتی گئی اور اللہ تعالےٰ نے اپنی مشیّت کے مطابق جب یہ فیصلہ کرلیا کہ اب انسانیت جوان ہوگئی ہے اور روز اُن کو ہدایت کی ضرورت نہیں رہی، تو اُس نے اپنے آخری پیغام دیا اور انسانیت کو یہ خراجِ تحسین پیش کیا کہ یہاں جہاں تک میرا تعلق ہے۔ میں تمہیں ہمیشہ کے لئے آزاد چھوڑتا ہوں۔ یہ آخری کلمات اللہ ہیں۔ ان میں ابدالآباد تک تبدیلی نہیں ہوگی۔ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنے زمان و مکان کے مطابق اپنے رہنے سہنے کے لئے خود قانون بناؤ اور زندگی کا معیار بلند سے بلند تر کرتے چلے جاؤ۔ میری طرف سے کوئی تازہ پیغام یا احکام نہیں آئیں گے۔ اس کو ختم نبوت کہتے ہیں۔

بدھ مت کا خیال ہے کہ آخری نبی مہاتما بدھ تھے۔ پارسی زرتشت کو، یہودی حضرت موسیٰؑ کو، عیسائی حضرت عیسےٰؑ کو خدا کا آخری پیغام بر مانتے ہیں۔ ہم سب ان کا احترام کرتے ہیں اور بصد احترام رسولِ کریمؐ کو آخری نبی مانتے ہیں۔ اپنی اپنی سوچ ہے۔ سب اپنی سوچ کے مطابق اپنے آپ کو صحیح سمجھتے ہیں، اور اگر گرو نانک یا مرزا غلام احمد صاحب اپنے آپ کو خدا کا نبی سمجھتے ہیں تو ہم ان کا بھی احترام کرتے ہیں۔ یہ ان کی اور ان کے ماننے والوں کی سوچ ہے لیکن بصد احترام ان کی سوچ سے ہمیں اختلاف ہے۔ قرآنِ کریم کے ارشاد کے مطابق اللہ تعالےٰ نے قرآن وحی کردینے کے بعد انسانوں کے ذریعے بلند اقدار بھیجنا بند کردیئے ہیں کیونکہ اس کی مشیّت کے مطابق یہ بلند اقدار ہر زمانے کا ساتھ دیں گی اور اب نئی اقدار کی ضرورت نہیں رہی۔

لیکن خدا "ریٹائر" نہیں ہوا کیونکہ "ایں کتاب زندہ قرآنِ حکیم" (اقبالؒ) ہماری سمجھ کے مطابق نہ OUT OF DATE ہوا ہے اور نہ کبھی ہوگا۔ تخلیقِ کائنات اور مکافاتِ عمل کے معاملات میں اللہ تعالیٰ اس وقت بھی مصروف ہے۔ ہمارے ساتھ اللہ تعالےٰ کا وعدہ ہے کہ یہ نہیں ہوسکتا کہ قرآن کے دیئے ہوئے قوانین کی خلاف ورزی بھی کرو اور ایک جنتی معاشرہ بھی بنالو۔ آپ جب بھی اللہ تعالےٰ کو DODGE کرنے کی کوشش کریں گے۔ وہ آپ کی راہ میں قائم و دائم، زندہ و پائندہ موجود ہوگا۔ اُس کے قوانین جاری و ساری رہیں گے۔ جو کوئی ایک فرد بھی اللہ تعالےٰ سے پوچھے گا کہ میری ہدایت کے لئے کون سا راستہ ہے۔ وہ اسے قرآنِ کریم کی طرف متوجہ کردے گا۔ اسی طرح جو بھی قوم قوانینِ خداوندی کی تلاش میں نکلے گی۔ اللہ تعالےٰ اُسے قرآنِ کریم کی طرف

DIRECT کردے گا۔ یہ ہے اللہ تعالےٰ کا تعلق بندے سے، انفرادی بھی اجتماعی بھی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ گارنٹی بھی دے رکھی ہے کہ جو کوئی میرے قوانین کے مطابق چلے گا، جنتی معاشرہ بنالے گا اور جو کوئی ان کے خلاف چلے گا، جہنمی معاشرہ بنالے گا۔ دنیا کے گردوپیش گھوم جاؤ۔ قوموں کے عروج و زوال پر غور کرو۔ ایسا ہی نظر آئے گا جیسا اللہ تعالےٰ نے بتایا ہے۔

اسلام

(ماخوذ از طلوعِ اسلام جنوری ۱۹۷۳ء)

قرآن کریم میں ہے کہ کائنات کی ہر شئے اس قانون کے سامنے سرِ تسلیم خم کئے ہوئے ہے جو اس کیلئے تجویز کیا گیا ہے۔ لَهٗ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۳/۴۲) اسی لفظ اَسْلَمَ سے اسلام ہے۔ یعنی کسی کے سامنے جھکنا۔ سرِ تسلیم خم کرنا۔ دوسری جگہ اسے لفظ سجدہ سے تعبیر کیا گیا ہے، جہاں کہا ہے کہ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۱۳/۱۵) کائنات میں جو کچھ ہے قوانینِ خداوندی کے سامنے سجدہ ریز ہے۔ اشیائے کائنات کا اس طرح قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرنا۔ ان کے اختیار و ارادے سے نہیں۔ انہیں اختیار و ارادہ دیا ہی نہیں گیا۔ وہ ان کی اطاعت کیلئے مجبور ہیں۔ انہیں ان قوانین کے خلاف مجالِ سرکشی نہیں۔ یارائے سرتابی نہیں۔ سورۂ نحل میں ہے وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ (۱۶/۴۹) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے۔ وہ جاندار اشیاء ہوں یا مظاہرِ فطرت۔ سب قوانینِ خداوندی کے سامنے سجدہ ریز ہیں اور ان سے کبھی سرکشی نہیں برتتے ان کی کیفیت یہ ہے کہ يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (۱۶/۵۰) جو کچھ ان سے کہا جاتا ہے وہ اس کی تعمیل کئے جاتے ہیں۔ ان کی اس روشِ زندگی کو اسلام کہا گیا ہے۔ یعنی قوانینِ خداوندی کی اطاعت، یکسر اطاعت۔ بلاکم و کاست اطاعت۔

حقائق و عبر

۱۔ گر ہمیں مکتب .....

لاہور سے پروفیسر رفیع اللہ شہاب رقمطراز ہیں کہ فرقہ اہلِ حدیث کے معروف سکالر جناب ڈاکٹر راشد رندھاوا صاحب نے ان سے حدیث کی ایک کتاب "المنتقی الاخبار" کا انگریزی زبان میں ترجمہ کروایا جو ڈاکٹر صاحب موصوف نے بے حد پسند فرمایا لیکن معاوضہ طلب کرنے پر پہلے انہوں نے ثوابِ دارین کمانے کا مشورہ دیا اور جب بات بڑھی تو ساڑھے اٹھارہ ہزار روپے کی جگہ پانچ ہزار روپے تھما کر چپ سادھ لی۔

ڈاکٹر صاحب کا یہ طرزِ عمل، بقول شہاب صاحب، اہلِ حدیث کے سرکردہ علماء بشمول جناب عبدالرحمان لدھیانوی، جناب صلاح الدین یوسف اور جناب اسحاق بھٹی صاحب کے علم میں ہے لیکن بایں ہمہ "مزدور کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کردو" والی حدیث ابھی تک شرمندۂ معنی نہیں ہوئی۔

طلوعِ اسلام: یہ واقعہ اگر صحیح ہے تو ہم اس کے سوا کیا کہہ سکتے ہیں کہ ؎

گر ہمیں مکتب و مُلّا است
کارِ طفلاں تمام خواہد شُد

جماعت اسلامی اور جہادِ کشمیر

جماعت اسلامی کے ترجمان، ہفت روزہ "ایشیا" لاہور کی ۳۰ جون ۹۱ء کی اشاعت میں جماعت اسلامی کی طرف سے ایک مبسوط مقالہ شائع ہوا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ:۔

"کشمیر کے مسلمانوں کے اندر راج کے خلاف ایک لاوا پک رہا تھا جو ۱۹۴۷ء میں پاکستان بننے کے موقع پر پھٹ پڑا اور ریاست کے مسلمانوں نے ہندو بنیئے کے

خلاف علم بغاوت بلند کیا اور پورے علاقے میں مسلح جہاد کے ذریعے ڈوگرہ فوج اور مقامی ہندو آبادی کو پسپا ہو کر بھاگ جانے پر مجبور کر دیا اور اس طرح ریاست کا ایک حصہ ہندو کی غلامی کے چنگل سے نکل آیا۔ لیکن ریاست جموں و کشمیر کا زیادہ بڑا حصہ جو آج تک ہندوؤں کے قبضہ میں ہے اس تک بھی مجاہدین تقریباً پہنچ چکے تھے قریب تھا کہ پونچھ شہر اور سری نگر کو بھی مکمل آزاد کروا لیا جاتا لیکن بھارت نے اقوام متحدہ اور سلامتی کونسل میں جا کر واویلا مچا کر سیز فائر کروا دیا۔"

طلوعِ اسلام: مقامِ صد شکر ہے کہ جماعت اسلامی کو بھی اعترافِ حقیقت کی سعادت نصیب ہوئی، ورنہ جہادِ کشمیر کے خلاف مولانا مودودی صاحب مرحوم کا مشہورِ زمانہ فتویٰ اس راہ میں بہت بڑی رکاوٹ رہا ہے۔

۳۔ شریعت ایکٹ اور تنظیم اسلامی

شریعت ایکٹ پر تبصرہ فرماتے ہوئے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کہتے ہیں:۔

"غیر ملکی پریس وزیر اعظم نواز شریف کی بجا طور پر تعریف کر رہا ہے کہ اس نے "مولویوں" کو خوب بے وقوف بنایا ہے۔ جس طرح موجودہ حکومت نے مذہبی عناصر کو غیر مؤثر کر کے انہیں دم سادھنے پر مجبور کر دیا ہے اس سے ثابت ہو گیا کہ اس ملک کی سیاست میں "مولویوں" کا کوئی عمل دخل نہیں بلکہ سیکولر طرزِ فکر ہی اس ملک کی اصل طاقت ہے اور وہی اس پر حکمران ہیں کیونکہ دستور اور سیاسی نظام حکومت پر بالادستی بھی قرآن و سنت کو نہیں بلکہ پارلیمنٹ کو دی گئی ہے۔ شریعت کا مشروط نفاذ کیا گیا ہے۔ کہ شریعت ہمیں منظور ہو گی بشرطیکہ وہ ہمارے موجودہ سیاسی نظام پر اثر انداز نہ ہو۔ اس شق کی منظوری سے شریعت کو بالادستی کیسے حاصل ہو سکتی ہے، بالاتر نظام تو رائج الوقت چلن ہے نہ کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کا عطا کردہ نظام۔ اس طرزِ عمل پر ہندوستان میں بھی بغلیں بجائی گئیں اور امریکی سفیر اوکلے بھی شریعت کے نفاذ پر چپ نہ رہ سکا، اسے مبارک باد دیتے ہی بنی کہ شریعت کے نام پر شریعت کا راستہ روکنے کا اس سے بڑا کارنامہ اور کمالِ فن اور کیا ہو گا؟ "ندائے خلافت" لاہور ۱۵ جولائی ۱۹۹۱ء صفحہ ۱۵)۔

۴۔ یہاں تک تو آئے .....

طلوعِ اسلام ۱۹۳۸ء سے کہہ رہا ہے کہ :-

"(ا) دین کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسانوں کو دوسرے انسانوں کی محکومی سے چھڑا کر ان سے خالص قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرائے۔ قوانین کی یہ اطاعت ایک نظامِ مملکت کی رُو سے ہو سکتی ہے اس کے بغیر دین (جو نظامِ زندگی کا نام ہے) متمکن نہیں ہو سکتا۔

(ب) رسول اللہؐ نے سب سے پہلے دین کا نظام قائم فرمایا۔ اس نظام میں قرآن کریم کے احکام و قوانین کی اطاعت کرائی جاتی تھی اور جن امور میں قرآنِ کریم میں صرف اصول دیئے ہیں ان کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے امورِ مملکت اُمّت کے مشورہ سے سرانجام پاتے تھے۔

(ج) رسول اللہؐ کے بعد دین کا وہی نظام حضورؐ کے خلفائے راشدینؓ نے جاری رکھا۔ اس میں امورِ مملکت سرانجام پانے کا وہی طریقہ تھا جو حضورؐ کے زمانہ میں رائج تھا۔ یعنی قرآنِ کریم کے احکام و قوانین کی اطاعت اور جن امور میں قرآنِ کریم نے صرف اصول دیئے ہیں ان کی چار دیواری کے اندر امّت کے مشورہ سے متعلقہ امور کے فیصلے۔ اس طریق کو خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کہا جاتا ہے۔

(د) بدقسمتی سے خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کا یہ سلسلہ کچھ عرصہ کے بعد منقطع ہو گیا اور دین کا نظام باقی نہ رہا۔ اس سے امّت میں انتشار پیدا ہو گیا۔ خلافت کے زمانے میں تمام امور دین کے نظام کے تابع رہتے تھے لیکن اب مذہب اور سیاست میں ثنویت پیدا ہو گئی۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری ہے۔

(ر) ہمارے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ پھر سے خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کا سلسلہ قائم کیا جائے جو امّت کو احکام و قوانین کے مطابق چلائے۔ اس نظام کی بلند ترین اتھارٹی کو مرکزِ ملت کہا جائے گا اور اس کی طرف سے جاری شدہ احکام کی اطاعت خدا اور رسولؐ کی اطاعت کے قائم مقام قرار پائے گی۔ ظاہر ہے کہ اس نظام کو چلانے والوں کی اپنی زندگی سب سے پہلے قوانینِ خداوندی کے تابع ہو گی۔

(۳) چونکہ دین کا نظام (خلافت علیٰ منہاجِ رسالت) زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہوگا اس لئے اس میں موجودہ ثنویت ختم ہو جائے گی۔ یعنی اس میں یہ نہیں ہوگا کہ سیاسی معاملات کے لئے حکومت کی طرف رجوع کیا جائے اور مذہبی یا شخصی امور کے لئے مذہبی پیشوائیت کی طرف۔ اس پر دونوں شیعے باہمد گر مدغم ہو جائیں گے۔"

تنظیم اسلامی کے امیر ڈاکٹر اسرار احمد صاحب فرماتے ہیں:۔

"امیرِ تنظیم اسلامی نے کہا کہ عہدِ حاضر کی جدید اسلامی ریاست اور اسلام کے سیاسی نظام میں اللہ تعالےٰ کی حاکمیتِ مطلقہ کو بنیادی حیثیت حاصل ہے، جب کہ جمہوریت کا اصول عوام کی حاکمیت ہے اور چونکہ اسلام کے نزدیک انسانی حاکمیت کا تصور کفر اور شرک کے مترادف ہے لہٰذا اب ہمیں جمہوریت کی بجائے خلافت کی اصطلاح استعمال کرنی ہوگی کیونکہ جمہوریت کو مشرف بہ اسلام کر کے بھی "حاکمیتِ عامہ" کے تصور سے جان نہیں چھوٹتی۔ جمہوریت کا تصور مغرب کی پیداوار ہے اور اس لفظ کا ذکر قرآن و حدیث کے علاوہ ہماری اسلامی تاریخ میں بھی کہیں نہیں ملتا، جبکہ خلافت کی اصطلاح قرآن و حدیث میں بھی متعدد اسالیب میں استعمال ہوئی اور یہی خلافت اسلامی تاریخ کا دورِ زریں ہے، جو کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی بیسویں صدی کے آغاز تک ایک زندہ حقیقت تھی۔ (ماہنامہ "میثاق" جولائی ۹۱ء ص۱۱)

طلوعِ اسلام: قرآن کا نظام اپنی نوعیت کا واحد اور منفرد نظام ہے اس لئے نہ وہ دنیا کے کسی نظام میں جذب ہو سکتا ہے اور نہ ان سے مفاہمت کر سکتا ہے۔ نظامِ خلافت سے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی مراد اگر وہی نظام ہے جسے رسول اللہ نے قائم فرمایا تھا تو الحمد للہ، ورنہ جمہوریت کا نام خلافت رکھ دینا تو ایسے ہی ہوگا جیسے بھگت رام یا ایشور داس کا نام عبداللہ رکھ دیا جائے۔

اِسلام کے خلاف عجمی سازشوں کی داستانِ جگر خراش

محترم غلام احمد پرویزؒ کی سیرتِ فاروقِ اعظمؓ پر شہرہ آفاق کتاب

شاہکارِ رسالتؐ

اسلام خطرے میں ہے

بیس ۲۰ کنال رقبہ میں تعمیر شدہ ایک وسیع و عریض، عالیشان بنگلہ کے نوکر گھروں کے ایک تنگ و تاریک کمرہ میں، سردیوں کی ایک کپکپاتی رات، ایک بچہ پیدا ہوتا ہے۔ سخت جاڑا لیکن کمرے میں آگ تک روشن نہیں۔ گرم کپڑے ماں کے پاس نہیں تو بچے کے لئے کہاں سے آئیں۔ ماں اسے چیتھڑوں میں لپیٹ کر چھاتی کے ساتھ لگا لیتی ہے کہ اسے کچھ حرارت پہنچے۔ وہ بھوک سے روتا ہے لیکن مسلسل فاقوں سے ماں بیچاری کے دودھ کے چشمے سوکھ چکے ہیں۔ بمشکل دو چار گھونٹ دودھ بچے کو مل سکا۔ وہ بلک رہا ہے۔ غمزدہ ماں کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے ہیں۔ باپ ماتھے پر ہاتھ رکھے بیٹھا ہے کہ پہلے ہی گذارہ مشکل تھا، اب اس مزید ذمہ داری کا بوجھ کیسے اٹھایا جا سکے گا۔

اُسی آن، سامنے بنگلہ کے ایک برق پاش کمرہ سے بھی ایک نومولود کے رونے کی پہلی آواز سنائی دیتی ہے — ایک چھوڑ، دو دو لیڈی ڈاکٹرز زچہ کے سرہانے، کئی نرسیں، کمرہ میں ہر قسم کا سامان، اعلیٰ درجہ کے نرم اور گرم کپڑے، دودھ پلانے کو انائیں — اور بطور حفظ ماتقدم، ولایتی دودھ کے ڈبے۔ وٹامنز کی شیشیاں اس پر مستزاد۔ چاروں طرف سے، مبارک باد، شہنائیوں، مٹھائیوں کی چہل پہل ہے۔ مولوی صاحب بچے کے کان میں اذان دینے کے لئے تشریف لائے تو ایک ہزار ایک روپیہ نذرانہ پیش کیا گیا۔ عقیقہ ہوا تو کتنے بکرے ذبح کئے گئے۔ ختنہ کی تقریب پر شہر بھر کے امراء کی دعوت ہوئی۔

اس دوران، نوکر گھر کے تنگ و تاریک کمرے میں پیدا ہونے والا بچہ، بدستور کپڑوں کے لئے ترستا اور دودھ کے لئے بلکتا رہا۔

کیا کسی بڑے سے بڑے دانشمند کی منطق بتا سکتی ہے کہ اس غریب (مالی) کے بچے نے کیا جرم کیا تھا جس کی اسے یہ سزا مل رہی ہے، اور ان خان صاحب کے صاحبزادے نے کون سا تیر مارا تھا جس کے

صلہ میں اسے یہ تمام آسائشیں میسر ہیں؟ برہمن نے اس کی یہ (ابلہ فریب) توجیہہ وضع کرلی کہ یہ ان کے پچھلے جنم کے کرموں (اعمال) کا نتیجہ ہے ۔ اس توجیہہ کی بنیاد غلط سہی، لیکن اس سے (کم از کم) منطقی نتیجہ تو مسکت مرتب ہوجاتا ہے۔ لیکن جو لوگ اس توجیہہ کو غلط قرار دیتے ہیں، ان کے پاس اس کا، اس کے سوا کوئی جواب نہیں ہوتا کہ یہ سب خدا کی مرضی پر موقوف ہے۔ اس نے جسے جیسا چاہا بنا دیا اور جس حالت میں چاہا رکھا۔ اس میں کسی کے لئے دم مارنے کی جا نہیں۔

وہ، یہ جواب دے کر مطمئن ہو گئے لیکن انہوں نے کبھی سوچا بھی کہ اس سے خود خدا کے متعلق کس قسم کا تصور پیدا ہوا؟ لیکن انہیں اس سے کیا غرض! لیکن ان کے اس جواب سے، خدا کا جس قسم کا تصور پیدا ہوتا ہے، جو شخص اُسے زبان پر لانے کی جرأت (یا حماقت) کر بیٹھے، اس کے لئے احتساب کا ڈنڈا اور فتویٰ کا کوڑا موجود ہوتا ہے۔

(۰)

پہلے تنہا مالی کام کرتا تھا۔ اب اس کی بیوی نے بھی محنت مزدوری شروع کر دی تاکہ کسی طرح روٹی کا دھندہ چل سکے۔ اس دوران میں، بچہ، رینگتے گھسٹتے چار پانچ سال کا ہو گیا۔ انہوں نے کسی نہ کسی طرح، اپنا پیٹ کاٹ کر بچے کو اسکول میں داخل کرا دیا۔ یہ صبح، پھٹے ہوئے سادہ کپڑوں میں ملبوس، بھوکا اسکول جاتا۔ وہاں اپنے ماں باپ کی مفلسی اور ناداری کے جرم کی پاداش میں، اپنے ہم مکتبوں کے حقارت آمیز طعنوں کا شکار، اور ماسٹر صاحب کے ڈنڈے کا ہدف بنتا۔ اس کے باوجود وہ ہمیشہ جماعت میں اوّل یا دوم آتا رہا۔

اُدھر خان صاحب کا صاحب زادہ چیفس کالج میں داخل ہوا۔ نوکر چاکر حلقہ بند، سواری کے لئے باہر موٹر، کالج میں گھوڑا۔ زرق برق پوشاک، اعلیٰ درجے کے کھانے، رہنے سہنے کی ہر قسم کی آسائش۔ نہ کسی چیز کی کمی، نہ کسی بات کی محتاجی۔ اس نے پانچ سات برس انہی عیش سامانیوں میں گزارے۔ عمر بڑھی تو مشاغل کی نوعیت میں فرق آگیا۔ ان کے لئے کالج کی فضا سازگار (یا کافی) نہیں تھی۔ کالج چھوڑ دیا۔ ولایت چلا گیا۔

مسلسل محنت، خوراک کی کمی، آرام کا فقدان، پریشانیوں کی بھرمار، مالی دن بدن کمزور ہوتا چلا گیا اور اس کے بعد بیمار پڑ گیا۔ گھر میں کھانے کے لئے نہیں تھا۔ علاج کے لئے پیسہ کہاں سے آتا۔ وہ مختلف ہسپتالوں کے برآمدوں میں ایڑیاں رگڑتا رہا کہ کہیں داخلہ مل جائے لیکن پیسے کے بغیر داخلہ کیسے مل سکے بالآخر، ایک دن ہسپتال کے برآمدے ہی میں جان توڑ دی ۔ ایک نامراد بیوہ، دو یتیم لڑکیاں، اور ایک

معصوم لڑکا (جو اس وقت آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا) "ورثہ" میں چھوڑے ــــ گھر میں دو چار برتن تھے، انہیں بیچ کر تجہیز و تکفین اور درود فاتحہ کا انتظام کیا۔ لوگ مُردے کو دفن، اور اس کی عاقبت بخیر ہونے کی دُعا کر کے، اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے، اور پچاس لاکھ کی آبادی میں سے کسی نے اتنا نہ پوچھا کہ اب اس بیوہ اور اس کے یتیم بچوں کی زندگی کیسے گزرے گی! بڑی مشکل سے خان صاحب نے اتنا کرم کیا کہ انہیں کچھ دنوں تک کے لئے کمرے میں رہنے کی اجازت دیدی۔ اب مالی کے بیٹے کو، ماں کے ساتھ مل کر محنت مزدوری بھی کرنی پڑتی تھی۔ اس کے باوجود اس نے پڑھائی جاری رکھی۔

دو ایک ماہ گزرے تھے کہ ایک رات، اچانک خان صاحب کا انتقال ہو گیا۔ (بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انہیں زہر دے دیا گیا تھا)۔ پانچ لاکھ کی انشورنس پالیسی، کئی مربعے اراضی، متعدد کوٹھیاں، دو ملیں، نقدی زیورات، موٹریں، ترکہ میں چھوڑیں۔ صبح کو صاحبزادہ صاحب ان سب کے مالک تھے ــــ ان پڑھ، اوباش عیاش، جس میں ایک پیسہ کمانے کی صلاحیت نہیں۔ اس کا شمار ملک کے پچاس دولت مند خاندانوں میں ہو گیا ــــ سرکار دربار میں ہر طرح کی عزت۔ حاکم، افسر، ہر شام اس کی کوٹھی پر، دُور دور تک شہرت، دو چار غنڈوں کے پشتیبان بنے۔ ایک دو سیاسی لیڈروں کے دوروں کے اخراجات کا ذمہ لیا۔ پھر ڈر کا ہے کا؟ جسے چاہا لٹوا دیا، جسے چاہا پٹوا دیا، اُس کی لڑکی نکلوا دی، اِس کی بہن اغوا کرا دی۔ قانون کے ہاتھ کو رشوت نے مفلوج کر رکھا تھا۔ اس لئے یہ اس کی گرفت سے مامون تھے۔ باقی رہی معاشرہ کی انگشت نمائی۔ سو اس کے لئے ہر جمعرات کی شام داتا دربار کی حاضری۔ محلہ کی مسجد کے امام صاحب کی تنخواہ۔ مسجد میں قالین پنکھے، برف، آئے دن نذر نیاز کی دیگیں، اولیاء کرام کے عرس، پیشہ ور گداگروں کے لئے صدقہ خیرات کا وافر ذخیرہ، یتیم خانوں کے لئے چندہ ــــ اور پھر لندن سے واپسی پر ہر سال حج اور عمرہ ــــ اس کے بعد، جو اس کے خلاف انگلی اٹھائے، یہ پورا لشکر اس کی آنکھ نکالنے کے لئے تیار ہو جائے۔

(۵)

مالی کے لڑکے نے، دو سال کی کوشش کے بعد میٹرک کر لیا۔ ویسے تو فرسٹ ڈویژن مل گئی لیکن کالج میں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ نوکری کی تلاش شروع ہوئی لیکن جس کے پاس نہ رشوت کے لئے پیسہ، نہ سفارش کے لئے رسائی ہو، اسے نوکری کہاں سے مل جائے ــــ ایک ایک دروازے پر دستک دی۔ ایک ایک آستانہ پر ٹھوکریں کھائیں لیکن دھکوں کے سوا کہیں سے کچھ نہ ملا۔ چھ ماہ کی سڑک پیمائیوں کے بعد، ایک دفتر میں چپراسی کی جگہ ملی۔ جگہ چپراسی کی لیکن کام، صاحب کی موٹر صاف کرنے کا۔ ضعیف اور بیمار ماں۔ دو بہنیں جن کی عمر اب شادی کے قابل ہو گئی تھی۔ ان کی ذمہ داری اور پانچ چار

سو روپے ماہوار تنخواہ ـــ ہر مہینہ کی یکم کو جب اس کی ہتھیلی پر پانچ سو روپے رکھ دیئے جاتے، تو دفتر والے مطمئن ہو جاتے کہ انصاف کا تقاضا پورا ہو گیا ہے۔ جو کچھ اس کا واجب تھا اسے ادا کر دیا گیا ہے۔ ـــ یہ دیکھنا کسی کی ذمہ داری نہیں تھی کہ اس پانچ سو روپے میں، ان چار نفوس کو دو وقت پیٹ بھر کر کھانے کو سوکھی روٹی بھی میسر آسکتی ہے یا نہیں! یہ دیکھنا کسی کی ذمہ داری نہیں تھی۔

یہ لڑکا بچپن سے نماز روزے کا پابند تھا۔ جمعہ کے خطبات میں خطیب عام طور پر دہراتا کہ خدا کی ایک صفت رازق بھی ہے۔ وہ جسے پیدا کرتا ہے اس کے رزق کی ذمہ داری بھی لیتا ہے ـــ وہ یہ سنتا تو جی ہی جی میں سوچتا کہ اگر یہ صحیح ہے کہ اپنی مخلوق کے رزق کی ذمہ داری خدا نے اپنے سر لے رکھی ہے، تو ہم بھوکے کیوں مر رہے ہیں! ہمارے معاملہ میں خدا کی یہ ذمہ داری پوری کیوں نہیں ہوتی؟ کیا ہم اس خدا کی مخلوق نہیں جو اپنی مخلوق کے رزق کا ضامن ہے؟ اس کے دل میں رہ رہ کر یہ سوالات اٹھتے لیکن اسے ان کا کوئی جواب نہ ملتا۔ وہ مولوی صاحب سے پوچھتا تو وہ اسے خشمگیں آنکھوں سے گھور کر دیکھتے اور یہ کہہ کر چپ کرا دیتے کہ اس قسم کے سوال کرنا اللہ رب العالمین کی شان میں گستاخی ہے۔ وہ آقا ہے ہم اس کے غلام ہیں۔ وہ مالک ہے ہم اس کے بندے ہیں۔ وہ جسے جس حالت میں چاہے رکھے۔ بندوں اور غلاموں کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ آقا اور مالک سے اس قسم کے سوال کریں۔ خدا اپنے بندوں کو آزماتا ہے۔ یہ دنیا لاش ہے اور اس کے چاہنے والے کتے۔ یہاں کے دولت مندوں کے لئے یہ چند روزہ مال و متاع ہے۔ عاقبت کا گھر غریبوں اور محتاجوں کے لئے ہے ـــ مولوی صاحب ان مواعظِ حسنہ کے بعد خوش ہو جاتے کہ ہم نے "مسئلہ سمجھا کر" اسے خاموش کر دیا ہے۔ لیکن انہیں کیا معلوم کہ اس کے سینے کی آتشِ خاموش، اندر ہی اندر، کس کس چیز کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنائے چلی جا رہی ہے، اور آخر الامر، یہ ایک دن کیسا شعلۂ جوالہ بن کر بھڑک اٹھنے والی تھی لیکن مولوی صاحب کو یہ کچھ سوچنے کی نہ ضرورت تھی، نہ فرصت۔ انہیں تو بلا محنت کئے سب کچھ ملتا تھا۔

(۵)

اس لڑکے کی ماں کا والد فوت ہو گیا تو ترکہ میں ایک مختصر سا مکان چھوڑ گیا جو اس کے حصہ میں آیا۔ وہ خوش تھی کہ اب کچھ آمدنی میں اضافہ ہو جائے گا اور عند الضرورت اسے فروخت کر کے، جوان لڑکیوں کے ہاتھ پیلے کر سکوں گی لیکن مکان میں جو کرایہ دار بستا تھا اس نے اسے کرایہ دینے سے انکار کر دیا۔ غریبوں اور بے کسوں کا یہ خاندان حیران تھا کہ یہ کیا ہوا؟ وہ مکان کا کرایہ کیوں نہیں دیتا تھا؟ انہوں نے ادھر اُدھر لوگوں سے ہمدردی کا واسطہ دے کر اسے کہلوایا کہ وہ یا کرایہ ادا کرے، یا مکان چھوڑ دے لیکن وہ کوئی چھٹا

ہوا بدمعاش تھا۔ اس نے صاف جواب دے دیا ــــ اور لوگ بھی خاموش ہو کر بیٹھ گئے کہ اس غنڈہ سے خواہ مخواہ کا بیر کیوں مول لیں! اب اس بڑھیا کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے ــــ ایک وکیل سے مشورہ کیا۔ اس نے (خدا واسطے کام کرنے کا وعدہ کر کے) سو روپے کا ابتدائی خرچ بتا دیا۔ اس نے کہیں سے قرض اٹھا کر سو روپے دے دیئے ــــ دیوانی عدالت کا مقدمہ۔ تین سال ہونے کو آئے۔ ابھی پہلی پیشی سے بات آگے نہیں بڑھی ــــ اب نہ اس بے چاری کی بات وکیل سنتا ہے، نہ وکیل کی شنوائی جج صاحب کی عدالت میں ہوتی ہے ــــ جب تک، اہلمدوں اور ناظروں کو راضی نہ کیا جائے، باب عالی تک رسائی اور شنوائی کیسے ہو؟ ایک دفعہ کوئی نیک دل، خدا ترس تحصیلدار آ گیا۔ وکیل صاحب نے کسی طرح بات ان تک پہنچائی تو اسے اس بیچاری کی حالتِ زار پر رحم آ گیا۔ اس نے اس غاصب سے مکان خالی کرانے کا کچھ بندوبست کیا۔ اس بدمعاش نے ان کے خلاف دو چار جھوٹی درخواستیں دلوا دیں۔ مکان تو کیا خالی ہونا تھا، الٹی اس بے چارے کے خلاف انکوائری شروع ہو گئی ــــ فرائض شناس، دیانتدار، شریف النفس خدا ترس، منصف مزاج افسر ہمیشہ اپنے ہمعصروں کی نگاہوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتے ہیں اور وہ اس موقعہ کی تلاش میں رہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح اس خارِ پہلو کو نکال باہر کیا جائے۔ لہٰذا اس قسم کی شکایتوں کو سچا ثابت کرنے کے لئے وہ ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں تاکہ اسے اپنے دیانتدار ہونے کی سزا ملے اور اسی قسم کے دوسرے دیانتدار اس سے عبرت پکڑیں۔ غنیمت ہے کہ تحصیلدار صاحب سستے چھوٹ گئے اور بات تبدیلی سے آگے نہ بڑھی۔ وہ تبدیل ہو گئے اور اس غاصب کا قبضہ مخالفانہ برحق ہو گیا۔

اب وہ کرایہ دار صاحب، مکان پر قبضہ جمائے بیٹھے ہیں، اور مکان کے مالک بیٹھے اپنی قسمت کو رو رہے ہیں۔ وہ بڑھیا بچاری اب اس فکر میں ہے کہ کہیں سے پانچ روپے مل جائیں تو وہ جناتی بابا سے تعویذ لائے جس سے (اس کی پڑوسن کے کہنے کے مطابق) وہ بدمعاش کرایہ دار بھسم ہو جائیگا۔

(۵)

لڑکیاں جوان ہو کر (یوں کہیئے کہ) بوڑھی ہو رہی تھیں اور ان کے لئے کہیں سے پیغام نہیں آتا تھا۔ ان کی جھگی کے قریب ایک نوجوان لڑکا رہتا تھا ــــ کسی مل میں مستری ــــ اس نے اپنی شرافت کا سکہ جما کر ان کے گھر میں آنا جانا شروع کر دیا۔ بڑی لڑکی سے اس کی شادی ہو گئی۔ شادی کے کچھ دنوں بعد وہ اچھی ملازمت کے بہانے کسی دوسرے شہر چلا گیا اور بیوی کو بھی ساتھ لے گیا۔ ایک عرصہ تک ان کی طرف سے خیر خیریت تک کی اطلاع نہ آئی۔ یہ بے چارے بہت پریشان تھے۔ جس شہر کا وہ کہہ کر گیا تھا، وہاں اس کا کوئی اتا پتہ نہ تھا۔ ایک دن ایک عورت آئی اور اس لڑکی کا یہ خفیہ پیغام لائی کہ میرا خاوند بری عادتوں کا شکار ہو گیا

ہے۔ مجھے اس نے قید کر رکھا ہے اور بات بات پر میری ہڈیاں توڑتا ہے۔ مجھے کسی طرح اس عذاب سے نجات دلاؤ۔ چپراسی بے چارہ مصیبتوں کا مارا، وہاں گیا۔ لمبے چوڑے جھگڑے کے بعد، وہ درندہ پانچ ہزار لے کر طلاق دینے پر راضی ہوا۔ اس غریب نے مرتے بھرتے کسی طرح روپے کا انتظام کیا اور مظلوم بہن کو گھر لے آیا۔ وہ کب تک بھائی کے سر پر بوجھ بنے بیٹھی رہتی۔ لیکن غریب مطلقہ سے نکاح بھی کون کرتا..... اس دوران میں، اس کا وہی پہلا خاوند، پھر کہیں سے آ گیا ـــ منت سماجت شروع کی۔ محلے کے لوگوں نے بھی اس کی تائید کی۔ وہ پانچ ہزار روپیہ واپس دینے پر بھی آمادہ ہو گیا۔ اس لئے مطلقہ نے اسے غنیمت سمجھا اور اس کے ساتھ دوبارہ نکاح کے لئے رضامند ہو گئی ـــ لیکن مولوی صاحب نے فتوے دے دیا کہ چونکہ اسے "تین طلاق" مل چکی ہے اس لئے یہ اپنے سابقہ شوہر سے نکاح نہیں کر سکتی۔ جب تک اس کا پہلے کسی سے حلالہ نہ ہو جائے۔ پوچھا گیا کہ حلالہ کیا ہوتا ہے تو انہوں نے بتایا کہ ایک رات کے لئے نکاح اور دوسری صبح طلاق ـــ پہلے تو اس کے لئے کوئی بھی آمادہ نہ ہوا لیکن جب ان سے کہا گیا کہ معاملہ "شریعت" کا ہے اور اس کے بغیر ان کا باہمی نکاح ہو نہیں سکتا تو وہ بے چاری سینے پر پتھر رکھ کر اس کے لئے آمادہ ہو گئی۔ اب سوال پیدا ہوا کہ حلالہ ہو کس سے؟ اس کے لئے مولوی صاحب نے کہا کہ چلئے! میں ہی اس کار خیر میں آپ لوگوں کی مدد کئے دیتا ہوں۔ بشرطیکہ مجھے سو روپیہ ساتھ دیا جائے۔ انہوں نے یہ زہر کا پیالہ بھی پی لیا۔ مولوی صاحب نے اپنی بیوی سے رضامندی کا کاغذ لکھوایا اور "قانون و شریعت" کے مطابق، اس مطلقہ سے نکاح کر لیا ـــ نکاح کیا تھا ایک رات کے لئے، لیکن مولوی صاحب کی نیت بدل گئی۔ اب وہ طلاق دینے کے لئے ایک ہزار روپیہ طلب فرما رہے ہیں۔

دوسری لڑکی کی شادی ایک رکشہ ڈرائیور سے ہوئی تھی۔ وہ اپنے گھر میں خوشحال تھی ـــ اس کے ہاں تین بچے ہوئے، کہ ایک شام، اس کی رکشا کو ایک تیز رَو موٹر نے اٹھا پھینکا۔ حادثہ میں رکشا چکنا چور ہو گیا اور اس کا ڈرائیور وہیں ہلاک ہو گیا۔ اس کی بیوی کا اب دنیا میں کوئی نہیں تھا ـــ بھائی لاچار کیا کرتا۔ گیا، اور اسے تین بچوں سمیت اٹھا کر اپنے گھر لے آیا ـــ ایک کمانے والا، (اور کمائی بھی چپراسی کی تنخواہ) اور اتنے جی کھانے والے ـــ اس پر مہنگائی کا یہ عالم کہ دال بھی دس روپے سیر سے کم نہ ملے۔ وہ سارا دن ملازمت کرتا۔ شام کو مختلف قسم کی محنت مزدوری کے کام کرتا۔ تب کہیں جا کر سوکھی روٹی نصیب ہوتی ـــ ایک دن، دفتر میں اوپر سے ہدایات آئیں کہ بجٹ زیادہ بوجھل ہو رہا ہے اخراجات کم کئے جائیں۔ اقتصادی ماہرین کی کمیٹی بیٹھی اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ چپراسیوں اور

دفتریوں کی کچھ اسامیاں تخفیف میں لائی جائیں۔ اس چھانٹی میں یہ بھی آگیا۔ اور ملازمت سے چھٹی مل گئی۔

اب وہ گم سُم سا رہنے لگا۔ اسے اسکول کے زمانے کا پڑھا ہوا ایک ہی شعر یاد تھا۔ وہ کبھی کبھی تنہائی میں اسے گنگنانے لگ جاتا کہ

عمر اپنی جو اسی طور سے گذری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

ماں، قریب دو سال سے بیمار، بستر پر پڑی تھی۔ ایک بہن مولوی صاحب کے شکنجے میں جکڑی ہوئی ہے دوسری بچوں سمیت اس کے ہاں اپنی قسمت کو رو رہی ہے۔ مکان (جو نانا کے ورثہ میں ملا تھا) بدستور انہی غاصب کے قبضہ میں ہے۔ وہ نہ اُسے چھوڑتا ہے نہ کرایہ دیتا ہے۔ یہ غریب خود ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گیا ہے۔ عمر بھر آٹے کی فکر سے ہی فرصت نہیں ملی جو اپنی شادی کا سوچتا ــــ اور وہ اکثر کہا کرتا ہے کہ میں نے یہی ایک کام سمجھ کا کیا ــــ یا یوں کہیئے کہ مجبوراً سمجھ کا ہو گیا ــــ کہ میں نے کبھی شادی نہیں کی ــــ اب اس میں بامشقت کام کرنے کی ہمت بھی نہیں رہی لیکن مشقت نہ کرے تو اتنے نفوس کا پیٹ کیسے پالے! یہی وہ مجبوری ہے جس کی وجہ سے وہ اپنی لاش اپنے کندھوں پر اٹھائے پھر رہا ہے۔

آزاد پارک میں جلسہ تھا۔ ایک بہت بڑے مولانا، جو اسلام کی حفاظت کے غم میں بڑے ٹھاٹھ کی زندگی بسر کر رہے تھے، دھواں دھار تقریر فرما رہے تھے۔ تان یہاں آکر ٹوٹتی تھی کہ ــــ اسلام خطرے میں ہے، سخت خطرے میں ــــ!

مجمع میں سے ایک آواز اُبھری کہ

مولانا صاحب! اسلام ہے کہاں جو خطرے میں ہے؟

مولانا صاحب نے چلا کر کہا کہ اسے پکڑو۔ یہ کمیونسٹ ہے۔ لوگوں نے اسے پکڑا، تو یہ وہی مالی کا لڑکا تھا۔ انہوں نے اس سے پوچھا کہ کیا تم کمیونسٹ ہو؟ اس سوال سے، وہ آتشِ خاموش جو ساری عمر اس کے سینے میں سلگتی چلی آرہی تھی، آتش فشاں پہاڑ کے لاوے کی طرح پھٹ کر امنڈ آئی۔ اس نے کہا کہ میں تو ایک غریب مزدور ہوں۔ میں نے کمیونسٹ کا لفظ بے شک سُنا ہے لیکن مجھے معلوم نہیں کہ وہ ہوتے کون ہیں۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ اسلام کا جو نقشہ یہ حضرات ہمارے سامنے کھینچتے رہتے

ہیں، وہ اگر کہیں موجود ہوتا تو اسے کسی قسم کا خطرہ نہ ہوتا۔ لیکن اگر "اسلام" وہی ہے جس کی موجودگی میں میری اور میرے جیسے لاکھوں مصیبت کے ماروں کی زندگی یوں گذرتی ہے، تو پھر آپ بھی سُن لیں اور مولانا صاحب بھی، کہ "وہ" اسلام" واقعی خطرے میں ہے۔ اسے ہزار مولاناؤں کے وعظ بھی نہیں بچا سکتے کہ صحیح اسلام بھیجنے والے خدا کا فیصلہ یہ ہے کہ باقی وہی بچے گا جو انسانوں کے لئے فائدہ مند ہوگا۔

وہ کچھ اور کہنے ہی والا تھا کہ کسی نے پیچھے سے آکر اس کے کان میں کہا کہ تمہاری جھونپڑی سے رونے کی آواز آرہی ہے۔ جلدی گھر پہنچو۔

طلوع اسلام نومبر ۱۹۶۹ء سے ماخوذ

قرآنی تعلیم بچوں کے لئے

قاسم نوری

کائنات

السلام علیکم بچو! آپ نے کائنات کا لفظ ہزاروں بار سنا اور پڑھا ہوگا لیکن بہت کم سوچا ہوگا کہ یہ کائنات ہے کیا؟ بہت سے بچے تو اس دنیا ہی کو کائنات سمجھتے ہیں اور بہت سے بچے خیال کرتے ہیں کہ جو کچھ اس زمین اور آسمان کے درمیان ہے بس وہی کائنات ہے لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ انسان ابھی تک اندازہ نہیں لگا سکا کہ یہ کائنات کتنی لمبی چوڑی ہے کہاں سے شروع ہوتی ہے اور کہاں ختم ہوتی ہے جانے کتنے لاکھ یا کروڑ برس گزر گئے، ابھی تک تو سائنسدان اس چھوٹی سی دنیا کی ابتدا کے بارے میں بھی کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکے کہ یہ کب وجود میں آئی ۔۔۔ آپ حیران ہوں گے کہ جس دنیا میں اربوں انسان بستے ہیں اور جس کے گرد چکر لگانے میں مہینے لگتے ہیں۔ اتنی بڑی دنیا کو میں چھوٹی سی دنیا کیوں کہہ رہا ہوں؟ لیکن جناب یہ کائنات جس کا میں ذکر کرنے والا ہوں اتنی بڑی ہے کہ ہماری یہ دنیا اس میں ایک نقطے یا ایک ذرے کے برابر ہوگی ۔۔۔ یہ چاند، سورج، ستارے، سیارے، اجرام فلکی اور ہماری دنیا جیسی لاکھوں دنیائیں اس کائنات میں اس طرح تیرتی پھر رہی ہیں جیسے سمندر کی سطح پر لہریں یا ہوا میں ذرے یا فضا میں ننھے منے بادل کے ٹکڑے۔

بھئی کمال یہ ہے اور سوچو تو عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ اتنی بڑی کائنات میں جس کی لمبائی

چوڑائی کا کوئی اندازہ ہی نہیں کر سکا اور جس میں لاکھوں کروڑوں زمینیں، کُرّے اور سیارے ہر وقت تیرتے رہتے ہیں، نہ تو یہ آپس میں ٹکراتے ہیں اور نہ ان میں کوئی فساد ہوتا ہے، نہ ان کی ترتیب اور عمل میں کوئی فرق آتا ہے اور نہ یہ ایک دوسرے کے لئے تباہی اور بربادی کا سبب بنتے ہیں بلکہ یہ دیکھ کر اور یہ سوچ کر انسان حیرت میں ڈوب جاتا ہے کہ یہ سب ایک دوسرے سے الگ الگ ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے اس قدر وابستہ ہیں کہ ایک کے بغیر دوسرے کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ سب آپس میں ایک دوسرے کی بقا، سلامتی اور زندگی کا باعث ہیں۔ مثال کے طور پر ایک کرّہ ہماری یہ دنیا ہے۔ اس دنیا کی زندگی اور بقا کا سامان چاند اور سورج اور بعض ستارے اور سیارے مہیا کرتے ہیں۔ سورج سے روشنی ہے۔ گرمی ہے ــــ چاند اور دیگر ستاروں سے مدوجزر ہیں ــــ موسم ہیں۔

ــــ ان میں سے اگر کوئی ایک بھی ہماری دنیا سے رُوٹھ جائے تو ہم تو اگلا سانس بھی نہیں لے سکیں گے ــــ بس اسی طرح ہر کرّہ دوسرے کرّہ کو فائدہ پہنچا رہا ہے اور اس کی سلامتی کا باعث ہے۔

ــــ اور پتا ہے یہ سب کس وجہ سے ہے ؟ بھئی یہ سب اس وجہ سے ہے کہ کائنات کی ہر شے اللہ کے قانون کی پابندی کر رہی ہے اور یہی بات تو اللہ تعالےٰ نے اپنے رسولوں اور کتابوں کے ذریعہ سے دنیا کے تمام انسانوں کو سمجھائی ہے کہ اگر کائنات کی ان چیزوں کی طرح سارے انسان بھی اللہ کے قانون کی اطاعت کرنے لگیں تو وہ بھی ہمیشہ امن اور سلامتی میں رہیں گے۔ یہی دنیا ان کے لئے جنت بن جائے گی۔

پیارے بچّو! کائنات کی طرح، اسکا موضوع بھی بہت بڑا ہے اور بھئی سب باتیں ایک دم یاد بھی تو نہیں رکھی جا سکتیں لہٰذا ہم بنیادی چند باتوں کا ہی ذکر کریں گے اور قرآنِ کریم کے حوالے سے

ضروری اور اہم باتیں سامنے لائیں گے سب سے پہلے یہ سمجھنا چاہیئے کہ ہر شے کا خالق، یعنی تخلیق کرنے والا، بنانے اور پیدا کرنے والا، اللہ ہے۔ (۱۰۳-۶/۱۰۲، ۱۳/۱۶، ۲/۲۵، ۳۹/۶۲، ۴۰/۶۲۔ اسی نے پیدا کیا، نکھارا سنوارا، ہر شے کے لئے قوانین، ضابطے اور پیمانے مقرر کئے اور منزل کی طرف جانے اور اپنے مقاصد پورے کرنے کے لئے ان کی راہنمائی کی۔ کائنات میں ہمیں جتنی چیزیں نظر آتی ہیں وہ جھٹ سے اسی شکل میں نمودار نہیں ہو گئیں بلکہ ان کی پیدائش کا آغاز ایک معمولی سے نقطہ سے ہوا۔ پھر وہ نشوونما پاتی ہوئی اگلی منزل میں پہنچیں اس طرح بتدریج اپنی موجودہ شکل اختیار کی۔ (۷/۵۴، ۱۰/۳، ۱۱/۷، ۲۵/۵۹، ۳۲/۴، ۵/۲۸، ۵۷/۴)۔

(باقی آئندہ)

مطبوعات النور پرنٹرز و پبلشرز

3/2 فیصل نگر، ملتان روڈ- پوسٹ بکس 4190 ، لاہور- 25

ٹیلیفون 042-485826

-1	قبلہ اول- بیت المقدس کے مسلمانوں کا قبلہ اول ہونے کے عقیدے کا جائزہ قرآن کریم کی روشنی میں- از حسن عباس رضوی مرحوم	45/= روپے
-2	لسان القرآن- عربی خود سیکھیے از پروفیسر رفیع اللہ شہاب	35/= "
-3	وطن کی مٹی گواہ رہنا- از پروفیسر محمد مظفر مرزا	50/= "
-4	تحریک پاکستان گولڈ میڈل- اعزاز یافتہ کارکنان تحریک پاکستان کا مکمل تعارف مرتبہ شعبہ تحریک پاکستان محکمہ اطلاعات و ثقافت- حکومت پنجاب	120/= "
-5	عزیز بھٹی شہید نشان حیدر- پاکستان کے مایہ ناز مجاہد کی داستان حیات- از اصغر علی گھرال	150/= "
-6	تاریخ پنجاب اور افاغنہ قصور کا کردار' از محمد ایوب خان	140/= "
-7	المعجم المفہرس- قرآنی الفاظ کا انڈکس اور ان کے مادے :-	
	اعلیٰ ایڈیشن	400/= "
	سٹوڈنٹ ایڈیشن	200/= "
-8	حکایت صادق- تحریک پاکستان گولڈ میڈلسٹ پروفیسر محمد صادق چوہدری کی داستان جہاد از پروفیسر منظور الحق صدیقی	40/= "
-9	مسلمانان ہند کا تاریخی فیصلہ - مرتبہ عبدالواحد قریشی	100/= "
-10	Sir Syed Ahmad Khan An An Educationist By Prof: Shamim anwar	50/= "
-11	Practical Handbook of Income Tax By Ikramul Haq	
	(i) Professional Edition Complimented By Update Service	500/= "
	(ii) Student Education	200/= "
-12	Pakistan: From Hash To Heroin By Ikramul Haq	200/= "
-13	Golden Jubilee of The Pakistan Resolution By Prof: Rafiullah Shehab	120/= "
-14	A Study of Islamic Writings in Pakistan - Allama Ghulam Ahmad Parwez By M. Iqbal Chawla	50/= "

زیر طبع کتب

-1 احکام القرآن میں تحریف- مودودی صاحب کی تفسیر تفہیم القرآن اور اصلاحی صاحب کی تفسیر تدبر قرآن کا ناقدانہ جائزہ- از پروفیسر رفیع اللہ شہاب

-2 قعر غلامی سے عرش آزادی تک - از پروفیسر محمد مظفر مرزا-

-3 اشاریہ مجلہ طلوع اسلام- ۱۹۳۸ تا ۱۹۹۰ مرتبہ خادم علی جاوید- لائبریرین اقبال اکیڈمی

-4 اقبال کا مرد مومن- مرتبہ خادم علی جاوید- لائبریرین اقبال اکیڈمی-

-5 علامہ اقبال کا نظریہ تعلیم- مرتبہ خادم علی جاوید لائبریرین اقبال اکیڈمی

-6 دولت پرویز- مفکر قرآن علامہ غلام احمد پرویز کی قرآنی فکر اپنے افکار و خیالات کی روشنی میں- مرتبہ محمد عمر دراز

-- In contrast the preacher thrives on hatred, fear division and sectarianism. This is their means of livelihood, their business. If human beings become one, the preacher will loose his job.

Looking back on what I have discerned in observing Parwez, a teacher and a preacher represent two cultural approaches. One, dynamic, forward looking, positive, free and creative. The other decadent, backward looking, negative bogged down in destiny and the status quo. One is happy the other is sad. As the unknown biographer of Spinoza said, "Those who only love Truth" will " approve" of a teacher. There have been many great teachers; I was lucky I came to know one of them.

##########

ANNUAL SUBSCRIPTION OF MONTHLY TOLU-E-ISLAM
CAN ALSO BE REMITTED TO THE FOLLOWING AGENCIES.

IN KUWAIT
Mr. Ubadur Rahman Arain, P.O Box 22412 Safat 13085.

IN CANADA
Mr. Abdul Rashid Qureshi, P O.Box 2303 Station C
Downsview,ONT M3N 2V8

IN UNITED KINGDOM
Mr. Maqbool Mahmood Farhat, 76 Park Road
Illford, ESSEX IGI ISF,

IN NORWAY
Malik Khadim Hussain, ELGTRAKKET 71,1277 OSLO 12,

IN DENMARK
Mr. Muhammad Afzal Khilji, GAMMEL KONGEVEJ 47 3.TH
1610 COPENHAGEN V.

IN SAUDI ARABIA
Mr. Asif Jalil, PO Box 693, Riyadh 1141.

ANNUAL SUBSCRIPTION - EQUIVALENT 18 US DOLLARS

REQUEST PAYMENT OF SUBSCRIPTION A MONTH AHEAD.

euphemistically described as "submission to Allah's will". Furthermore, this "Allah's will" is identified with ancestor worship. The sentimental appeal to follow the path of the forefathers is a constant refrain, deadening the rational faculties of the listeners. No wonder it was so refreshing and enlightening to listen to Parwez when everything was opted for on merit, on its intrinsic value. The vision broadened, avenues opened, the issues were seen in there depth by going into the roots of it all. The preacher can only shout hollow slogans from the house top and screech out 'fatwas' against those who disagree.

Actually, the preacher has no link or understanding ofesfast the human psyche. He is not concerned with the multitude he addresses as persons. The fountain of love and concern is dry within him. So all he can do is to emphasis dry ritualism and to hurl hellfire and brimstone against those who dare falter. He does not think of explaining why one should "pray", why one should "fast", why one should perform "pilgrimage", except that if you are not a practising believer" you are doomed forever. One sadistic pleasure they evince is in striking terror into the hearts of the people, cursing them, abusing them and throwing them into hell in the hereafter. The here and now, the hell on this earth , pain in the mind and body that exists around us, they are not concerned about. The wretched of the earth want a friend here, they want here and now a balm to soothe their nerves, to heal their wounds . If the preachers are not concerned about this earth , I am not convinced of their concern about
any other world.

This is where lies the greatness of Parwez. He not only educated us he listened to eneryone's woes and placed his fatherly hands on our weary heads. A teacher has to be a caring person, reaching out to allay the fears and the worries that one is destined to suffer in an unjust system. Last but not the least, a teacher is a universal phenomenon, be belongs to humanity, not to any particular locale or people. A teacher is a member of a human family, united in human brotherhood . Parwez broke down our prejudices, dislikes, barriers of all kinds that seek identities other than human.

A question, a doubt is the beginning of knowledge. Parwez was at his best when challenged with a question, His evenings were mostly spent in answering questions for that was the time when visitors were welcomed. Some of us who visited him frequently were occasionally chided if we failed to put a question over a period of time. We must have stopped thinking, reading and observing or else why is not a question being shot at him? "Pull yourself up, or your minds will get rusty", he warned During the annual conventions, my favourite session used to be the question-answer session, and he knew it. Invariably, he would remind me that day with a twinkle in his eyes."Hope you'll be there, its your favourite session."

What a contrast to the ' *Maulanas*' in whose congregation a question is unheard of. In fact a question asked is enough of a reason to declare a fatwa of " Kufar. " Do atrophied, unquestioning minds promise a "tomorrow" ? These preachers do not have even a "today" to offer for they themselves are living in "Yesterday".

A teacher can only flourish in a democratic set-up. No wonder that Parwez's presence exuded freedom and equality, in contrast to authoritarianism of the preachers. In contrast to parwez's smiling joyful image,. we are confronted with faces that are severe, topped with a perpetual frown, overlooking hollow, sunken eyes in a death-like mask. These faces are symbols of undemocratic attitudes and do not auger well for the country. No wonder it has been often remarked that Pakistan, with so many preachers multiplying in geometrical proportions, has lost its smile and whatever little hope it had for democracy.

As a teacher, Parwez was always at pains to make us understand the issue at stake. He would repeat any number of times if need be, until the point went home, He constantly reminded us the Quranic injunction not to follow any thing that one does not understand. This is a sure path to disaster. However, the preacher relies in exactly what the Quran has warned against-- blind obedience. The concept of opting for Allah's Laws through free will and understanding and reason is

like Shakespearean Antony he arouses the emotions of the "impudent mob" unleashing destruction and anarchy all around with shouts of "seek, burn, fire, kill and slay." The base of the preacher is the fluctuating nature of emotions which can be twisted in any directions he wants. Each time the emotions subside, the effect it leaves behind is pessimism and hopelessness, the fire extinguished into ashes.

In Parwez's attitude was implicit a belief in the respect for the humans. I can never imagine him exploiting or using others for his own purposes. Parwez the teacher was ever at pains to build self-respect, confidence and independence among his students no matter how much the latter may disagree with him. As long as he helps in making him a thinking person he was happy. The preacher on the other hand demeans and destroys the 'self' of his listeners and Surely nothing could be more criminal and inhuman than this approach. "SELF" is all that a human has; to destroy this is to destroy humanity itself. What do we have left then?

Parwez was very humble and modest, almost to the point of self effacing whenever perforce he had to make a reference to himself. He always described himself as a struggling student of the Quran, and no more. He was open minded and an excellent listener. Sometimes, very garrulous people turned up with the obvious intention of hearing him talk or have a dialogue with him about his" unconventional and unknown" concepts to the " common soul", but ended up by talking non-stop themselves, He gave them his time and listened with wrapt attention even if they did not have much to say. I marvelled at his patience. When he lectured or conversed, he never talked "at" them, never made them feel different or inferior. But a preacher who is always preaching"at " the congregation, be he a priest or a demagogue of a politician, he develops a false sense of righteousness and behaves in an arrogant manner. He thinks he knows everything. This is dangerous for the people at large, for this kind of so-called scholarship or leadership can dampen the spirit of the people and make them feel guilty and joyless.

barring a few liberal and sympathetic friends, avoided a reference to Parwez. A strange hush hush atmosphere prevails, a silence pregnant with an explosive awareness. I have been through pain and sometimes guilt at my fear, cowardice or what some may describe as a simple defensive common sense, call it what you may, at not being able to quote Parwez as liberally and generously as one quotes Socrates or Aristotle, Machiavelli or Chanakya, Voltaire or Raussean, J.S Mill or B. Russell, Freud or Fromm, Marx or Mao and all by name, Nay, I did quote him copiously, but his name was taboo, and I cannot say for sure whether even now I am above this inhibition . The walls of prejudice and ignorance are more impregnable than steel and iron.

Two sides of this wall offer an intriguing contrast, On one side stands a teacher, on the other a preacher and the twain can never meet . A lot has been written on teachers and teaching, but I shall restrict myself to the concept I evolved by sheer observation, of one of the greatest teachers, Parwez. Since our society is so priest-ridden it will not be difficult to show the other side of the picture. They abound in ever increasing number in every nook and corner of the country, blowing hot and cold down our necks whether we like it or not.

Parwez, the teacher, always appealed to the rational in humans, carefully reasoning with his listeners, developing their intellectual faculties in the process with tremendous patience. The beauty of it all was that the listener felt free to agree or opt out. It's not that Parwez did not take a stand, he was a highly committed person, but he gave the other person the confidence that he/she could fight back if need be. The natural affect of this attitude on the listener is calmness, hope and stability within, in spite of the change that might have taken place. The " common soul" is afraid of change, it is easy to follow the beaten path , But in Parwez's teaching change came without destruction.

The opposite of this can be now visualized. A preacher is emotional and sentimental. He relies on the irrational and passionate forces within humans, and

works. His views do sound "unusual and unknown to common souls", but that is where lies his fame. This has caused the envious and the ignorant to create an atmosphere in the country in which everyone, though strangely aware of Parwez's presence, is afraid to mention his name or quote him by name. Many scholars, writers, journalists and teachers readily quote some of the basest and mediocre of Quranic commentators for or against their own views, but Parwez's name is an anathema. This does not mean that they do not quote him, they quote him galore --his words, concepts and terminology, but they do not owe their debt to him. Even those who may dare, may soon have to retreat. For instance during President Ayub's regime, President House circular was printed daily in the newspapers, listing the names of all those who visited him that day. Once in a while Parwez's name was also seen in the list. This created an uproar, so much so, that Ayub, ostensibly a powerful and highest military executive in the country had to buckle down to the" impudent mob" and the name was henceforth withdrawn, which of course does not mean that Parwez did not meet him again. And yet it is the "soul" of this "impudent mob" that benefited from these visits, for Parwez played, no mean part in the promulgation of the "Muslim Family Laws of 1961" and the "Land Reforms". These measures would have been far more radical if Ayub had withstood the pressure of the vested interests, the "envious" and the "ignorant". Another example is the helplessness of the PTV . It is sitting pretty on a twelve hours marathon interview it programmed on Parwez's life and works, but it dare not televise it. As for the politicians and the priestcraft, both in their nature Machiavellian and power hungry and in favour of the status quo have been using his words and concepts as slogans and beating them hollow by repetition.

Come to think of it, I am part of the same milieu. Certainly not through envy or ignorance, but certainly through the fear of loosing the opportunity of communicating Quranic wisdom to my students, I dared not mention his name in class. I do not know whether to call it funny or criminal that though eventually everyone who knew me also knew my affiliations and the source of my knowledge and information, every one

A TEACHER WAS BORN

By
Shamim Anwar

July 9, 1903, a teacher was born, perhaps one of the greatest humankind has experienced through the ages. As this date approached, my mind has been recollecting my experiences of having known Parwez as a scholar, an advisor, a neighbour, a fatherly figure, a friend and above all a teacher. His scholarship stands out in his erudite " Insan ne Kia Socha" alone, notwithstanding his other great works, but he also stands out in the reaction he engendered and still does. I find a very apt similarity in a comment I came across in Spinoza's oldest biography by an unknown friend which I would like to share with my readers. I am sure they will enjoy the relevance, the power and beauty of the words and concepts expressed therein." Our age is very enlightened " he says, " but it is not therefore more just to great men. Although it is indebted to them for its most precious enlightenment, and happily benefits therefrom, yet, whether from envy or from ignorance, it cannot bear that anyone should praise them, and it is surprising that one should have to conceal himself in order to write their life, as if he were about to commit a crime; especially is this so if these great men have made themselves famous by views that are unusual and unknown to common souls. For them, under the pretext of doing honour to received opinions, however absurd or ridiculous, they defend their own ignorance to which they sacrifice the sanest light of reason and, so to say, truth itself. But whatever risk one may run on such a thorny course, I would have profited little indeed from his philosophy whose life and maxims I take upon myself to write, if I were afraid to undertake it .....even if this work", continues the biographer, " which I consecrate to the memory of an illustrious friend, be not approved by everybody, it will at least be approved by those who only love Truth and who have a kind of an aversion for the impudent mob."

I have read and re-read this comment, each time to find it more illuminating , more relevant and truer than ever before with reference to Parwez's life and